کراچی کی سماجی اور سیاسی محرومیاں: رئیس امروہوی کے قطعات کے تاریخی عوامل

فیض الدین احمد *

(۱)

سندھ کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی معاملات پر نظر رکھنے والوں کو اس بات کا پوری طرح ادراک ہے کہ قیامِ پاکستان کے چند ہی برسوں بعد حکمران طبقے کی مخصوص پالیسیوں کے نتیجے میں سندھ کے اندر ایک مخصوص قسم کی بے چینی اور انتشار نے جنم لینا شروع کر دیا تھا۔ اس بے چینی نے ون یونٹ کے دوران اندر ہی اندر ایک پکتے ہوئے لاوے کی شکل اختیار کر لی تھی[۱]۔ بہ نظر غائر دیکھا جائے تو یہ بات پوری طرح عیاں ہو جائے گی کہ سندھ کے دوسرے طبقوں اور گروہوں مثلاً اردو بولنے والے مہاجروں، پنجابی آبادکاروں اور پٹھان محنت کشوں کے گوناگوں مسائل سے قطع نظر، خود سندھیوں میں احساسِ محرومی بھی کوئی سادہ اور بسیط شے نہیں بلکہ بہت سی مختلف النوع محرومیوں اور بے چینیوں کا معجون مرکب ہے جو کئی تہوں اور متعدد سطحوں پر مشتمل ہے[۲]۔ سندھ کا منظر نامہ ایک ایسی تصویر پیش کرتا ہے جس پر بے یقینی اور تشکیک کی دبیز دھند چھائی ہوئی ہے۔ قومیتوں کے تانوں بانوں نے ایسے جال بُن رکھے ہیں کہ انھیں دیکھ کر ایک عجیب سے خوف کا احساس پورے جسم میں سرائیت کرنے لگتا ہے۔ یہ تصویر دھندلاہٹ سے آگے بڑھ کر طوائف الملوکی، بدانتظامی، افراتفری، فتنہ و فساد، رشوت ستانی اور قانون شکنی کے ہیولوں میں تبدیل ہو کر دہشت گردی اور قتل و غارت گری کی صورت میں پورے معاشرے کا حصہ بن جاتی ہے۔[۳]

بلاشبہ وادیِ سندھ کے پیچیدہ اور الم ناک حالات، انتشار اور انارکی کی ایک طویل تاریخ اور معاشی اور سیاسی پس منظر رکھتے ہیں۔ جن کا تفصیلی جائزہ معاصرانہ حقائق کو مکمل تناظر اور عواقب میں سمجھنے کے لیے اشد ضروری محسوس ہوتا ہے، لیکن موضوعاتی محدودات کے پیشِ نظر نہایت مختصر جائزہ یہاں پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ سندھ کی تاریخ اور سیاسی و سماجی حالات پر لکھی گئی متعدد کتب میں اعجاز الحق قدوسی کی تاریخ سندھ کا مطالعہ کافی سود مند

*ریسرچ اسکالر، کراچی گریمر اسکول۔ واٹس ایپ نمبر: ۰۳۰۰۹۲۹۴۱۰۶

ثابت ہو سکتا۔اس کے علاوہ سید مظہر جمیل نے اپنی تصنیف آشوب، سندھ اور اردو فکشن کے ابتدائی صفحات میں مختصراً ان تمام حکمرانوں کی تفصیلات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے جو مختلف وقتوں میں یہاں قابض رہے۔[۴]

جہاں تک سندھ میں بسنے والی مختلف نسلوں اور گروہوں کی آبادی کا تعلق ہے، قدیم عہد میں تصنیف کی گئی کتابوں میں اس بابت زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔البتہ ہنری پوٹنجر نے کراچی کی بابت لکھا کہ اس شہر کی پہلی مردم شماری تالپوروں کے دور ۱۸۰۹ء میں ہوئی، جس کے مطابق کراچی کی کل آبادی ۶۵۰۰ نفوس پر مشتمل تھی۔دوسری مردم شماری ۱۸۱۳ء میں ہوئی جس میں آبادی کا تناسب دگنا یعنی ۱۳۰۰۰ ظاہر کیا گیا۔اس بار مردم شماری کے ساتھ ساتھ خانہ شماری کا اہتمام بھی کیا گیا جس کے مطابق فصیل کے اندر مکانات کی کل تعداد ۳۲۵۰ تھی۔اس مردم شماری کے مطابق شہر میں ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے کہیں زیادہ تھی[۵]۔ ۱۸۲۰ء میں کیپٹن میک مردو نے سندھ کے دورے کے دوران یہاں کے مختلف شہروں کی بابت کہا کہ حیدرآباد کی آبادی ۳۰،۰۰۰، ٹھٹھہ ۲۰،۰۰۰ اور اس کے مقابلے میں کراچی کی کل آبادی ۱۵۰۰۰ نفوس پر مشتمل تھی[۶]۔ برطانوی قبضے سے قبل ٹی۔جی۔کاریس اور کیپٹن ایس۔وی۔ڈبلیو۔ہارٹ (Captain S. V. W. Hart) نے کراچی سے متعلق بمبئی کے انگریز افسروں کو ۱۸۳۹ء میں جو خفیہ رپورٹ ارسال کی اس میں کراچی کی آبادی صرف ۱۳۸۵۰ بتائی گئی۔اس رپورٹ کے مطابق شہر میں ۹۰۰۰ کے قریب ہندو اور ۴۸۵۰ مسلمان آباد ہیں[۷]۔ ۱۸۸۱ء میں سندھ کی کل آبادی ۲۵۴۲۹۷۶ تھی۔ ۱۹۳۱ء تک یہ تعداد ۳۹،۰۰،۰۰۰ تک جا پہنچی[۸]۔ سید مظہر جمیل نے سہواً یہ تعداد انچاس لاکھ درج کی ہے[۹]۔ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق سندھ کی آبادی ۴۴،۰۴۹۰۸ تک جا پہنچی جب کہ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۱ء کے جائزے میں آبادی ۴۹،۲۸۰۵۷ تک بڑھ گئی۔

اس دوران کراچی کی آبادی کا جائزہ لیا جائے تو انیسویں صدی کے نصف اوّل تک کی مردم شماری کا جو جائزہ مذکورہ صفحات میں پیش کیا گیا،اس کے مطابق انگریزوں کے قبضے کے بعد ۱۸۴۲ء کے وقت اس شہر کی آبادی کا اندازہ تقریباً ۱۵۰۰۰ لگایا گیا۔ ۱۸۵۰ء کی مردم شماری کے مطابق ۱۶،۷۷۳، ۱۸۵۶ء میں یہاں کی آبادی ۲۲،۲۲۷، ۱۸۶۱ء تک ۵۶،۸۵۹ اور بیس برس بعد ۱۸۸۱ء میں یہاں کی آبادی بڑھ کر ۵۶۰،۷۳ تک جا پہنچی[۱۰]۔اس دوران سب سے تیز رفتار اضافہ ۱۸۵۶ء سے ۱۸۶۱ء کے درمیان دیکھنے کو ملتا ہے اور یہ اضافہ ۱۵۶ فی صد تک ہے[۱۱]۔ عارف حسن نے لوراگائے اور احمد حسین صدیقی کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا کہ ۱۸۵۶ء سے ۱۸۷۲ء تک کراچی کی آبادی میں کوئی اضافہ نہیں ہوا[۱۲]۔ ۱۸۴۷ء میں سندھ کو کمشنری قرار دے کر صوبہ بمبئی سے ملحق کر لیا گیا۔یہاں کا پہلا کمشنر کیتھ پرنگل (Robert Keith Pringle) ۱۸۴۷ء کی ابتدا میں کراچی پہنچا۔بعد میں یہ سلسلہ ۹۰ برس تک جاری

رہ کر ۱۹۳۶ء میں مسٹر آر۔ ای۔ گبسن (Raymond Evelyn Gibson) پر ختم ہوا۔اس دوران کراچی میں سر بارٹل فریئر (Henry Bartle Edward Frere)۱۸۵۱ء۔۱۸۵۶ء، جنرل جون جیکب (John Jacob) ۱۸۵۷ء۔ ۱۸۵۸ء، جوناتھن ڈنکن انوایراٹرئی (Jonathan Duncan Inverarity) ۱۸۵۹ء۔ ۱۸۶۲ء، سیموئل مینس فیلڈ (Samuel Mansfield) ۱۸۶۲ء۔۱۸۶۷ء، میجر سر ولیم لاکیر میری ویدر (William Lockyer Merewether) ۱۸۶۷ء۔ ۱۸۷۷ء، فرانس ڈیوس میل ول(Francis Dawes Melville)۱۸۷۷ء۔۱۸۷۸ء، ہنری نیپیئر بروار سکن (Henry Napier Bruce Erskine)۱۸۷۹ء۔ ۱۸۸۷ء، چارلس بریڈلے پریچرڈ (Charles Bradley Pritchard)۱۸۸۸ء۔ ۱۸۸۹ء اور آرتھر چارلس ٹریور (Arthur Charles Trevor)۱۸۸۹ء۔۱۸۹۰ء تک کمشنری کے پہلے زمانے کا اختتام ہوتا ہے۔اس دوران یہ شہر ہندوستان کے مشہور شہروں میں شمار ہونے لگا۔اس کی آبادی میں تیز رفتار اضافہ ہوا۔ تجارت میں دن دگنی رات چوگنی ترقی ہوئی۔ شہر کی دولت میں اضافہ ہوا۔ دنیا بھر کے تاجروں سے یہاں روابط بڑھے اور دیکھتے ہی دیکھتے پندرہ ہزار آبادی والا یہ شہر ایک لاکھ کی آبادی میں تبدیل ہوگیا۔اس دور میں کراچی میں ہندو، مسلمان اور پارسی تاجروں کی کمپنی کے علاوہ متعدد یورپی کمپنیوں کے دفاتر بھی کھل گئے اور اس شہر نے ہندوستان کے دوسرے شہروں کی نسبت قابل رشک حیثیت حاصل کر لی[۱۳]۔

یہاں کی تجارت میں اضافے کا بڑا سبب امریکی خانہ جنگی تھا جس کی وجہ سے تجارتی سامان کی ترسیل انگلستان کے لیے بند ہوگئی۔ چناں چہ انگلستان کے کپڑے کے کارخانوں کے لیے خام مال کے طور پر امریکی کپاس کی جگہ سندھ کی کپاس نے لے لی۔ کپاس کی تجارت میں تیزی کے باعث چیمبر آف کامرس کی ضرورت پیش آئی جس نے شہر کی معاشی خوش حالی میں اہم کردار ادا کیا۔ لیکن امریکی خانہ جنگی کے خاتمے کے بعد کراچی کی تجارت کی مالیت ۶ کروڑ ۶۰ لاکھ روپے سے گر کر ۳ کروڑ ۸۰ لاکھ روپے تک آگئی۔ ۱۸۶۱ء میں قائم ہونے والی سندھ ریلوے نے بھی اس تجارتی ترقی نے اہم کردار ادا کیا۔ عارف حسن کے مطابق ۱۸۷۲ء سے ۱۹۰۱ء تک کراچی کی آبادی دگنی سے بھی زیادہ ہوگئی۔ ریلوے کے ذریعے کپاس کی پیداوار کراچی سے بیرون ملک جانے لگی[۱۴]۔ یہاں اس امر کو ذہن میں رکھنا بھی ضروری ہے کہ ۱۸۸۱ء تک کی آبادی کے جو اعداد و شمار یہاں پیش کیے گئے ہیں ان کے مطابق سندھ کی ساڑھے پچیس لاکھ کی آبادی میں سے کراچی میں صرف ۷۳۰۵۶ لوگ آباد تھے جو پورے سندھ کی کل آبادی کا تقریباً تین فی صد بنتے ہیں۔ ان اعداد و شمار کو پیش کرنے کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ آئندہ کے صفحات میں جب کراچی کے بڑھتے ہوئے شہری مسائل کی تفصیلات کا ذکر ہو تو اس دور کے اعداد و شمار اور شہری سہولیات کا موازنہ کرنا آسان ہو۔

کراچی کی آبادی میں مسلسل اضافے کے ساتھ ساتھ ہزاروں کی تعداد میں غریب افراد روزگار کی تلاش میں اس شہر میں کھنچے چلے آئے جو روزانہ بندرگاہ، بازار اور نئے قائم صنعتی علاقوں میں کام کرتے تھے۔ ان لوگوں کی رہائشی ضروریات کو پورا کرنے کا کوئی مناسب انتظام نہیں تھا۔ لہٰذا یہ مزدور طبقہ اور قدیم مچھیرے پرانے شہر کے اطراف میں آباد ہونا شروع ہوئے۔ اس زمانے میں ان کے کچے گھر اور بے ترتیب جھگیاں اس بے ترتیبی سے قائم ہوئیں کہ دنیا کے کم ہی شہر اس کی مثال میں پیش کیے جا سکیں گے۔ ان علاقوں میں صحت عامہ کا بھی کوئی کام نہیں ہو سکتا تھا۔ مسٹر مرامزا نے جو حکومت بمبئی کے سرویر تھے، اپنی رپورٹ *Development of Karachi* میں لکھا کہ پرانے شہر کی گنجان آبادی میں آبادی کا اڑتالیس فی صد حصہ ایسے کمروں میں رہائش پذیر ہے جہاں ایک ایک کمرے میں چھے یا اس سے بھی زیادہ افراد رہتے ہیں[۱۵]۔

سندھ کے قبضے اور دارالحکومت کی کراچی منتقلی کے وقت سندھ کو بمبئی پریزیڈنسی کا ایک ضلع اور کراچی اس ضلع کا صدر مقام ٹھہرا۔ چوں کہ انگریز فوجی یہاں مقیم ہونے لگے، لہٰذا ان کی اشیاے ضرورت کی فراہمی کے لیے وہ علاقے ابھر کر سامنے آئے جنھیں آج ہم صدر، کنٹونمنٹ یا چھاؤنی کا علاقہ کہتے ہیں۔ اس زمانے میں ضلعی انتظامیہ کے دفاتر سول لائنز میں قائم ہوئے۔ اس طرح یہ شہر دو واضح حصوں میں تقسیم ہونا شروع ہوا۔ ایک انگریزوں سے پہلے کا پرانا دیسی شہر اور اس کے مضافات اور دوسرا جدید یورپی طرز کا شہر جو کنٹونمنٹ، صدر بازار اور سول لائنز کے علاقوں پر مشتمل تھا۔ اسی دور میں کراچی بندرگاہ کو بھی ترقی دی گئی۔ ہندوستان میں اپنی نوعیت کی پہلی میونسپل کمیٹی وجود میں آئی[۱۶]۔ انگریز دور میں قائم ہونے والے تقریباً تمام ترقیاتی مراحل، تجارتی ادارے، بندرگاہ کی ترقی، عمارات، آمد و رفت کے ذرائع، آب رسانی کے بدلتے وسائل، تعلیمی ادارے، ثقافتی مراکز، ادارۂ ترقیات کراچی کا قیام، تفریح گاہوں اور دیگر اہم واقعات پر احمد حسین صدیقی[۱۷] اور عثمان دموہی[۱۸] و دیگر مصنفین نے کافی معلومات فراہم کی ہیں۔ تفصیلات سے بچنے کے لیے یہاں ان پہلوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف سیاسی اور سماجی منظر نامے پر توجہ مرکوز رکھنا ہی مناسب ہو گا تاکہ اردو شاعری پر پڑنے والے اثرات کا جائزہ لیا جا سکے۔

جنگ آزادی کے بعد کراچی کی آبادی میں اضافے کا جو رجحان جاری تھا وہ اگلی چند دہائیوں تک اپنی اسی رفتار سے جاری رہا۔ لوراں گائے (Laurent Gayer) کے مطابق ۱۸۹۰ء میں ۳۳ فی صد اضافے کے بعد کراچی کی آبادی ۹۸۰۰۰ تک جا پہنچی۔ ۱۹۰۱ء میں ۳۹ فی صد اضافے کے ساتھ ۱۳۶،۲۹۷، ۱۹۱۱ء میں ۳۷ فی صد اضافے کے ساتھ ۱۸۶،۷۷۱، ۱۹۲۱ء میں ۳۰ فی صد اضافے کے ساتھ ۲۴۴،۱۶۲، ۱۹۳۱ء میں ۲۳ فی صد اضافے کے ساتھ ۳۰۰،۷۷۹ اور ۱۹۴۱ء میں ۴۵ فی صد اضافے کے ساتھ ۴۳۵،۸۸۷ تک جا پہنچی[۱۹]۔ عثمان دموہی نے ۱۹۴۱ء کی

مردم شماری کا حوالہ دیتے ہوئے سہواً یہ تعداد چھے لاکھ تک بتائی ہے[۲۰]۔ جب کہ سید مظہر جمیل نے عارف حسن کا حوالہ دیتے ہوئے سہواً یہ تعداد ڈھائی تین لاکھ درج کی ہے[۲۱]۔ جب کہ عارف حسن نے اپنی تصنیف میں یہ تعداد ساڑھے چار لاکھ تک ہی بتائی ہے[۲۲]۔

دوسری طرف مذکورہ صفحات میں بیان کیا جاچکا ہے کہ ۱۹۴۱ء تک سندھ کی مجموعی آبادی ۴۴،۰۴۹۰۸ تھی۔ اس لحاظ سے سندھ کی کل آبادی کا ۱۹اعشاریہ ۸ فی صد حصہ ۱۹۴۱ء میں کراچی میں مقیم تھا۔ اس سے قبل ۱۸۸۱ء کے حوالے سے یہ بتایا جاچکا ہے کہ پورے سندھ کی آبادی کا تقریباً تین فی صد کراچی میں مقیم تھا۔ جو اگلی چھے دہائیوں میں بڑھ کر سندھ کی آبادی کا ۱۰افی صد تک ہو گیا۔ اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کراچی کے اس مجموعی اضافے کے مطابق شہری سہولیات کی طرف بھی توجہ دی گئی یا نہیں؟ اس بابت قیام پاکستان سے قبل لکھی گئی ان غیر ملکیوں کی تصانیف ہماری مدد اور رہنمائی کرتی ہیں جن کا کسی نہ کسی نسبت سے اس شہر سے تعلق قائم ہوا۔ اس حوالے سے مذکورہ صفحات میں مسٹر مرامز کی رپورٹ کا حوالہ دیا جاچکا ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ کراچی کے بارے میں جو قصے کہانیاں سنائے جاتے ہیں، مرامز کی بات اس کی نفی کرتی ہے۔ ایسا نہیں کہ کراچی کی سڑکیں دھلا نہیں کرتی تھیں یا کراچی کا تمام ہی علاقہ گندگی کا ڈھیر ہوا کرتا تھا، لیکن محض ان سڑکوں کی دھلائی جن کے گرد انگریز مقیم تھے، پورے شہر کی صفائی ستھرائی اور نکاسیِ آب کی صورت حال سے جوڑنا محض مبالغہ آرائی کے سوا کچھ نہیں۔ بارٹل فریر کے زمانے کی صورت حال کا ذکر خود اسی نے ان الفاظ میں کیا کہ "میں جب بھی کراچی کے پرانے شہر کا دورہ کرتا ہوں، اسے دنیا کا گندا ترین علاقہ پاتا ہوں اور ہر طرف سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے ہوتے ہیں"[۲۳]۔ پینے کے صاف پانی کا مسئلہ بھی ہمیشہ سے اس شہر کے بڑے مسائل میں شمار کیا جانا چاہیے[۲۴]۔ اس بابت بہت سے اقدامات کے باوجود آج بھی یہ شہر پانی کے شدید ترین بحران کا شکار نظر آتا ہے۔ عثمان دموہی نے لکھا کہ:

> انگریزی تسلط کے بعد سے کراچی اکثر طاعون اور ہیضے کی وبا کا شکار رہتا تھا۔ ۱۸۴۶ء میں ہیضے کی وبا نے ایسی شدت اختیار کی کہ سات ہزار سے زائد شہری لقمۂ اجل بنے۔ آبادی شہر چھوڑ کر مضافات کے کھلے میدانوں میں منتقل ہو گئے اور شہر شہر خموشاں کا منظر پیش کرنے لگا[۲۵]۔

ظاہر سی بات ہے اس سانحے اور ہلاکتوں کی بنیادی وجہ شہر کی گندگی، نکاسی آب کی ناکافی سہولتیں اور پینے کے صاف پانی کی قلت تھی۔ چارلس نیپیئر نے اس بدترین صورت حال سے نبٹنے کے لیے ۱۸۴۶ء میں ایک کنزرویٹنسی بورڈ بھی قائم کیا[۲۶]۔ ۱۹۲۹ء میں کراچی میونسپل کارپوریشن کے اس وقت کے صدر جمشید جی نسروان جی نے واضح طور پر یہ موٴقف اپنایا کہ کراچی میں تعینات ہونے والے اعلیٰ فوجی افسروں نے کراچی کے نہایت عمدہ علاقے کو کینٹ ایریا

قرار دے کر اس پر اپنا قبضہ جمار کھا ہے۔ تقریباً ایک صدی گزرنے کے باوجود کراچی کے اہم مقامات پر فوجی اداروں کا قبضہ ہنوز برقرار ہے۔ کرنل ینگ کیتھ نے اس زمانے کے کراچی کی قلمی تصویر کھینچتے ہوئے لکھا:

> حد نگاہ تک سبزے کا نشان تک نہ تھا۔ گرد و غبار کو سبزہ بہ نظر تحقیر دیکھتا تھا۔ قمری اور بلبل کے لیے نگاہ ترستی تھی۔ نہ کہیں چشمہ آب شیریں تھا اور نہ شفاف ندی۔ البتہ ایک دریائے شور ضرور تھا[۲۷]۔

رچرڈ برٹن(Richard Francis Burton)نے شہر کی گندگی کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھا کہ:

> شہر میں ہر طرف گندگی کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں جن کی وجہ سے کراچی ایک دیہات کا منظر پیش کر رہا ہے۔ شہر کی تنگ سڑکیں کوڑا کرکٹ سے اٹی ہوئی ہیں اور رہائشی مکان بھی گندگی سے مستثنیٰ نہیں[۲۸]۔

سندھ کا سب سے بڑا مسئلہ ۱۹۴۷ء کے بعد شہری آبادی میں ہونے والی تبدیلیوں کے باعث سماجی، معاشی اور سیاسی تبدیلیوں کے موجودہ حقائق کے ساتھ سائنسی بنیادوں پر ایک ایسا تصفیہ ہے جسے لسانی گروہ قبول کر لیں۔ موجودہ سندھ کا بنیادی مسئلہ ۱۹۵۱ء تا ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے درمیانی عرصے میں صوبے کی آبادی میں ہونے والا ہوش ربا اضافہ ہے۔ ۱۹۸۱ء تک سندھ کی آبادی ۱۹،۸۰۰،۰۰۰ تک جا پہنچی۔ اعداد و شمار کے مطابق پورے ملک میں آبادی میں اضافے کی شرح ۲۷۰ فی صد جب کہ سندھ میں ۳۰۱ فی صد تک رہی[۲۹]۔ سید مظہر جمیل نے سہواً ۱۹۵۱ء میں سندھ کی آبادی ایک کروڑ اٹھانوے لاکھ[۳۰] ظاہر کی ہے جب کہ ۱۹۵۱ء میں سندھ کی کل آبادی ۴۹۲۸۰۵۷ تھی۔ اس دوران کراچی کی آبادی ۱۶۱ فی صد اضافے کے ساتھ ۱۹۵۱ء میں ۱،۱۳۷۶۶۷ تک پہنچ گئی[۳۱]۔ اس طرح سندھ کی کل آبادی کا ۲۳ فی صد حصہ کراچی میں مقیم تھا۔ محض دس برسوں میں کل سندھ کی آبادی کی دس فی صد آبادی بڑھ کر ۲۳ فی صد تک جا پہنچی جو کراچی میں مقیم تھی۔ یوری گنکوفسکی نے پاکستان کی مختلف قومیتوں اور لسانی اکائیوں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا کہ ۱۹۲۳ء کے وسط تک ہندوستان سے پاکستان کی طرف جن لوگوں نے ہجرت کی ان کی تعداد ایک کروڑ یعنی آبادی کا دس اعشاریہ سات فی صد تھی[۳۲]۔ اس مدت میں نوے لاکھ غیر مسلم پاکستانی چھوڑ کر ہندوستان چلے گئے۔ اس سلسلے میں سندھ کے جنوبی علاقوں کے علاوہ کسی اور شہر کو آبادی کا اس قدر دباؤ برداشت نہیں کرنا پڑا جس قدر کراچی اور سندھ کے دیگر شہروں کو کرنا پڑا۔ ۱۹۶۱ء میں کراچی کی آبادی ۲۰۴۴۰۴۴، ۱۹۷۲ء میں ۳۶۰۶۷۴۶ اور ۱۹۸۱ء تک ۵۴۳۷۹۸۴ تک پہنچ گئی جو پورے سندھ کی مردم شماری کی رپورٹ کے بموجب ۱۹۸۰۰۰۰۰ یعنی ۲۷ اعشاریہ ۴۶ فی صد تھا[۳۳]۔

موجودہ سندھ کا سب سے بڑا مسئلہ ہی ۱۹۵۱ء تا ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے درمیانے وقفے میں صوبے کی آبادی بالخصوص کراچی کی آبادی کا ہوش رُبا اضافہ ہے۔اس دوران شماریاتی جائزے کے مطابق پورے پاکستان کی آبادی میں ۲۷۰ فی صد اور سندھ کی آبادی میں ۳۰۱ فی صد تک اضافہ دیکھنے میں آیا[۳۴]۔جب کہ کراچی میں یہ اضافہ ۲۶۸ فی صد تک رہا[۳۵]۔۱۹۹۱ء میں سندھ کی آبادی ۱۹۵۱ء کے مقابلے میں ۹ گنا اضافے کے ساتھ تقریباً ساڑھے چار کروڑ تک پہنچ گئی۔سید مظہر جمیل کے مطابق غیر سرکاری اعداد و شمار کے مطابق بیسویں صدی کے خاتمے تک سندھ کی آبادی پانچ کروڑ سے تجاوز کر چکی ہے[۳۶]۔گویا سندھ نے مردم شماری میں دس سالہ تغیّرات کے سارے ریکارڈ توڑ دیے۔اس غیر سرکاری جائزے میں کتنا غلو ہے اس بات سے قطع نظر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہت تیزی سے سندھ کے شہری علاقوں میں آبادی کا تناسب بڑھا ہے اور یہ شرح بیسویں صدی میں ۴۵ سے ۵۰ فی صد تک پہنچنے کا امکان ہے۔محمد علی صدیقی کے مطابق ہم ایک ایسے سندھ میں رہ رہے ہیں جہاں سندھی اور اردو بولنے والے دو بڑے لسانی گروہوں کے علاوہ پنجابی اور پشتو بولنے والوں کی بھی معتدبہ تعداد موجود ہے۔اس طرح سندھی قوم پرست و کلا سندھ کی جغرافیائی اور انتظامی سالمیت برقرار رکھنے کے لیے اور خاص طور پر وفاق پاکستان میں اردو بولنے والوں اور سندھ میں مستقل آباد پنجابی اور پشتون آبادی کو سندھی تسلیم کیے بغیر اس صوبے کو متحد رکھنے میں دشواری محسوس کریں گے[۳۷]۔

۱۹۴۷ء کے بعد مہاجروں کی آمد نے آبادی کے اس توازن کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔اس کے علاوہ ون یونٹ کے قیام کے بعد پاکستان کے دیگر علاقوں سے آنے والوں کی یلغار نے صوبۂ سندھ کی آبادی کے تناظر کو بالکل درہم برہم کر کے رکھ دیا اور اب سندھ کی Demographic صورتِ حال مسلسل تغیّر پذیر ہے۔ایک اندازے کے مطابق تقسیم ہند کے نتیجے میں لگ بھگ دو سے ڈھائی کروڑ افراد کو اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر نقل مکانی کے عذاب سے گزرنا پڑا۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والے مہاجرین کی تعداد ترکِ وطن کر کے جانے والے شرنارتھیوں سے کہیں زیادہ تھی۔ چناں چہ سندھ سے جانے والے ۹ لاکھ ہندوؤں کے مقابلے میں آنے والے مہاجرین تین گنا زیادہ تھے۔ابتدا میں صرف چھے لاکھ مہاجر کراچی آئے جن کی تعداد ۱۹۵۱ء میں دس لاکھ تک ہو گئی۔ اتنی ہی تعداد حیدرآباد، سکھر، میرپور خاص اور نواب شاہ وغیرہ میں آباد ہونے والے مہاجرین کی بھی تھی۔۱۹۶۱ء کے بعد ہندوستان سے نقل مکانی تقریباً رُک چکی تھی۔ بعد میں محض اکا دکا خاندان ہی ہجرت کر کے پاکستان میں داخل ہو سکے ہوں گے۔البتہ سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد تقریباً ڈیڑھ لاکھ مہاجرین بنگلا دیش سے یہاں آ کر آباد ہوئے۔ اس طرح ہندوستان سے سندھ نقل مکانی کرنے والوں کی تعداد تیس لاکھ سے زیادہ نہ تھی لیکن گزشتہ نصف صدی میں آبادی کے تیز رفتار اضافے کے نتیجے میں یہ تعداد کم و بیش ڈیڑھ کروڑ تک بتائی جاتی ہے[۳۸]۔

بعض حلقے یہ تعداد دو کروڑ تک بتاتے ہیں۔ اتنی ہی تعداد پنجابی اور پٹھان آباد کاروں کی بھی ہو گی۔ اس طرح غیر سندھیوں کی تعداد سندھی بولنے والوں سے تجاوز کرتی دکھائی دیتی ہے۔ جیسے سندھ تحریک کی تیار کردہ ایک دستاویز کے مطابق ہر سال تقریباً ۵ لاکھ ۶۴ ہزار افراد باہر سے آکر سندھ میں آباد ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے آبادی کا تناسب مسلسل تغیّر پذیر رہتا ہے۔ نتیجتاً بھیانک معاشی، معاشرتی اور انتظامی مسائل پیدا ہوتے چلے جا رہے ہیں[۳۹]۔ اور سندھ ہر روز ایک نئے سانحے سے دوچار ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

قیام پاکستان کے وقت ۱۹۴۷ء کے بعد مہاجروں کے قافلے آنا شروع ہوئے تو وہ شہر جو صرف تین لاکھ نفوس کے لیے بنا تھا، نے دس لاکھ بے خانماں افراد کو اپنی گوشۂ عافیت میں کشادہ دلی سے سمیٹ لیا۔ شہر کے اندر اور باہر تمام پختہ و نیم پختہ عمارتیں، چھپر، سائے بان، احاطے، کھلے میدان مہاجر کیمپوں میں تبدیل ہو گئے۔ راتوں رات بانس اور چٹائیوں کی جھونپڑیوں اور جھگیوں کے جنگل کے جنگل اُگ آئے جن میں لٹے پٹے بے آسرا لوگ زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے۔ ان لوگوں کو بنیادی شہری سہولیات تک میسر نہ تھیں اور نہ ہی اتنی آبادی کو فوری سہولیات مہیا کرنا ممکن تھا۔ چناں چہ کراچی کی مضافاتی بستیاں کورنگی، ملیر، ڈرگ روڈ، سعود آباد، اور نگی ٹاؤن، لیاقت آباد اور دیگر بہت سی کچی پکی بستیوں میں غریب اور متوسط مہاجر خاندانوں کی آباد کاری کی گئی۔ آس پاس صنعتی علاقے بھی قائم کیے گئے[۴۰]۔ ۱۹۴۷ء میں یہاں قائم صنعتی کارخانوں کی تعداد اکتالیس تھی جو اگلے بیس برسوں میں بڑھ کر تین ہزار سے زیادہ ہو گئی۔ پاکستان کی تمام مصنوعات کا ایک چوتھائی حصہ اس شہر میں تیار ہونے لگا[۴۱]۔ اس دوران شہر کی متعدد رہائشی اسکیمیں ناظم آباد، نارتھ ناظم آباد، پی۔ای۔سی۔ایچ۔ایس، فیڈرل بی ایریا، کے۔ڈی۔اے۔ اسکیم، گلشن اقبال، گلستانِ جوہر، کراچی ٹاؤن شپ، نارتھ ٹاؤن شپ، سرجانی ٹاؤن، اور نگی ٹاؤن وغیرہ جیسی وقتاً فوقتاً اس شہر کی رہائشی ضرورتوں کے تحت بنائی گئیں جن پر لوگوں نے ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن سے سودی قرضے حاصل کر کے جگمگاتی فیشن ایبل سوسائٹیاں قائم کر لیں۔ ان بستیوں میں اندرون سندھ کی نسبت زیادہ آسودہ حال لوگ آباد ہوئے اور اس طرح شہر میں آسودہ اور ناآسودہ بستیوں کے دو متضاد کلچر وجود میں آئے[۴۲]۔ احمد حسین صدیقی نے قیام پاکستان سے لے کر ۹۰ کی دہائی تک مختلف طبقات کے لیے جو رہائشی اور ترقیاتی اسکیمیں شروع کیں ان کی تفصیلات پیش کرتے ہوئے لکھا کہ:

> تمام بڑے شہروں کی طرح کراچی بھی بے شمار مسائل کا شکار ہے بلکہ یہ شہر تحقیقی مضامین میں اور رپورٹوں میں ضروری شہری سہولتوں کے فقدان اور پیچیدہ ترین مسائل کے حامل شہر کی حیثیت سے ایک ''کیس'' یا مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے[۴۳]۔

اس شہر کے گونا گوں مسائل پر ایک ایسے شخص کا اعتراف ہے جو خود بھی ادارۂ ترقیاتِ کراچی میں ڈائریکٹر جنرل کے عہدے سے سبک دوش ہوئے۔ جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس شہر میں تعینات افسران بھی اس معاملے میں کس قدر بے بس رہے ہیں۔ کراچی کی سندھ سے علاحدگی اور پھر کراچی سے دارالحکومت کی اسلام آباد منتقلی نے یقیناً کراچی کی ترقی پر منفی اثرات مرتب کیے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ نقصان ان لسانی گروہوں، بھتا خوروں، دہشت گردوں اور زمین کی ناجائز خرید و فروخت کرنے والوں نے پہنچایا۔ ان لوگوں نے ذاتی اور گروہی مفادات کے حصول اور لسانی منافرت نے سندھ کے شہروں کو طویل عرصے تک یرغمال بنائے رکھا۔ اسی طرح اندرونِ سندھ میں بھی متعصب سندھیوں اور شر پسند عناصر نے یہی کردار ادا کیا۔ اس طرح دیکھا جائے تو سندھ میں آباد سندھیوں، مہاجروں، پشتونوں اور دیگر تمام لسانی اکائیوں نے اس شہر سے لیا تو بہت کچھ لیکن اسے اپنی منافرت کی بھینٹ چڑھا کر وہ ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے کہ آئندہ کئی نسلیں مل کر بھی اس کی تلافی نہیں کرپائیں گی"[۴۴]۔

سندھ میں منافرت کی فضا پیدا کرنے میں ان ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی شہری اور دیہی متروکہ جائیداد کی غیر منصفانہ تقسیم، کلیموں اور سیٹل منٹ کی بندر بانٹ نے اہم کردار ادا کیا۔ نوزائیدہ ملک کی سول نوکر شاہی نے مہاجروں کی آبادکاری کے نام پر جو گورکھ دھندا پیش کیا اس نے مہاجروں اور سندھیوں کے دلوں میں ابتدائی زمانے میں ہی ایک خلیج پیدا کردی تھی۔ سندھ، بلوچستان اور سرحد میں کل ۸ لاکھ ۵۰ ہزار مہاجرین نے نقل مکانی کی جب کہ یہاں سے جانے والے شرنارتھیوں کی تعداد ۵۶ لاکھ سے زائد نہ تھی۔ سندھ سے تقریباً دس لاکھ ہندوؤں نے ترک وطن کیا اور ان کی جگہ ۲۰ لاکھ مہاجر سندھ میں وارد ہوئے۔ ۱۹۶۱ء تک اس تعداد میں مزید اضافہ ہوا۔ مشرقی پنجاب سے آنے والے چھے لاکھ مہاجرین کو جب پنجاب نے فاضل قرار دیا تو ان لوگوں نے بھی سندھ کا ہی رخ کیا۔ شہری متروکہ جائیدادیں نسبتاً کم تھیں۔ لہٰذا ان کی الاٹمنٹ کے سلسلے میں دھاندلی، رشوت اور جعل سازی کے ہتھکنڈے کھلے عام استعمال کیے گئے۔ معاشرے میں رات و رات صاحبِ جائیداد اور مال دار ہونے کا کلچر عام ہوا۔ طمع اور خود غرضی نے ابتدائی زمانے میں ہی جڑیں مضبوط کرنا شروع کردیں۔ سندھیوں اور مہاجروں میں اصل جھگڑا اس وقت شروع ہوا جب زرعی اراضی کی تقسیم کا معاملہ درپیش ہوا۔ ہندوؤں نے سندھ میں کل تیرہ لاکھ ایکڑ زرعی زمین چھوڑی تھی جن میں سے سات لاکھ ایکڑ زمین پر سندھ کے بااثر زمین داروں نے مقامی اہل کاروں اور ریونیو ڈپارٹمنٹ سے ساز باز کرکے قبضہ کرلیا تھا۔ بقیہ چھے لاکھ ایکڑ زمین محکمۂ سیٹلمنٹ کے توسط سے مہاجروں میں تقسیم کی گئی تھی۔ مذکورہ قابض شدہ زمین آج تک واگزار نہیں کرائی جاسکی۔ پھر جن مہاجروں کو زرعی زمینیں ملیں بھی تو وہ اونے پونے بیچ کر شہر میں لوٹ آئے۔ اس طرح شہری اور دیہی مخلوط معاشرے کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا[۴۵]۔

اس نقل مکانی کا نتیجہ یہ بھی نکلا کہ کراچی میں آبادی کا منظر نامہ ہی یکسر تبدیل ہو گیا۔ وہ شہر جہاں قیام پاکستان سے قبل ۶۱.۲ فی صد سندھی اور محض ۶.۳ فی صد اردو اور ہندی بولنے والوں کی آبادی مقیم تھی، اس شہر میں اکیاون فی صد ہندو اور بیالیس فی صد مسلمان تھے۔ ۱۹۵۱ء تک پوری کی پوری صورتِ حال بدل گئی اور ہندوستانی مہاجرین کی آمد کے بعد سندھی بولنے والوں کی آبادی محض ۸.۶ فی صد تک رہ گئی جب کہ اردو بولنے والے پچاس فی صد تک اس شہر میں بس گئے۔ اس میں صرف دو فی صد ہندو اور ۹۶ فی صد تک مسلمان تھے[۴۶]۔ یعنی وہ ہندو آبادی جو اس شہر میں نمایاں طور پر چھائے ہوئے تھے، ان کی جگہ ان مہاجرین نے لے لی تھی۔ ان تبدیلیوں کا کراچی کی ثقافت اور سیاست پر گہرا اثر ہوا۔ متروکہ جائیداد کی تقسیم کی ابتدا ہی میں ملک کے ایک اہم ترین سیاست دان افتخار الدین نے کلیم کے ذریعے متروکہ جائیداد کے بٹوارے کی نہ صرف مخالفت کی بلکہ یہ تجویز بھی پیش کی کہ بجائے اس امر کے کہ پاکستان میں بھی وہ زمین دار جو ہجرت کر کے یہاں آ گیا ہے، پھر سے اپنی طبقاتی حیثیت کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہو سکے، اس متروکہ جائیداد کے ذریعے عوامی بہبود کا ایسا خود کار امدادی نظام متعارف کرایا جائے جو ضرورت مند مہاجرین کو مالی اور تکنیکی امداد فراہم کرے[۴۷]۔ لیکن نوکر شاہی کی سازشوں سے اس تجویز کو عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا۔

۱۹۴۷ء میں جب کراچی کو پاکستان کا دارالحکومت بنایا گیا اور اسے سندھ سے علاحدہ کر کے وفاق کا حصہ بنایا گیا تو بے شمار سرکاری عمارتیں جو اس سے قبل صوبے کی ملکیت تھیں، وفاقی حکومت کے قبضے میں چلی گئیں۔ عارف حسن نے اس واقعے کو کراچی اور سندھ کا پہلا سیاسی تصادم قرار دیا ہے[۴۸]۔ ظاہر سی بات ہے کہ سندھ کے دانش وروں اور سیاست دانوں نے اس علاحدگی پر سخت اعتراضات کیے۔ انھوں نے اس عمل کو مہاجرین کو نوازنے کی پالیسی کے مترادف قرار دیا۔ جب کہ تلخ حقیقت اور ستم ظریفی یہ ہے کہ وہ متروکہ جائیداد اور نوکر شاہی کی سازشوں سے سندھ کا بے وسیلہ ہاری جس طرح محروم رہے بالکل اسی طرح مہاجر محنت کش بھی یہاں یکساں طور پر محروم رہے۔ نتیجتاً منافرت، حسد اور چپقلش کا خمیازہ بھی براہ راست انھی محروم طبقات کو برداشت کرنا پڑا[۴۹]۔ آج بھی اس ظلم کے نظام کی وجہ سے بے وسیلہ اور بے بس ہاری نسل در نسل غلامی کی زنجیروں میں بندھا ہوا ہے اور ان موروثی ہاریوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہی ہو رہا ہے[۵۰]۔ دوسری جانب غریب محنت کش مہاجر بھی کراچی کی غریب بستیوں میں کس مپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ غرض ون یونٹ کی پوری مدت میں ایسی سرگرمیاں جاری رہیں جنھوں نے سندھی قوم پرستی کے جذبات کو خوب ابھارا۔ سندھی صحافت نے بھی اس میں نمایاں کردار ادا کیا۔ نتیجتاً پہلے سے موجود نفرت اور محرومی کا احساس مزید تلخ شکل اختیار کرتا چلا گیا۔

سندھ کی شہری آبادی میں ہونے والی سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کے موجودہ حقائق کا سائنسی تجزیہ نہایت ضروری ہے۔ سندھ کے دوسرے بڑے لسانی گروپ یعنی اردو بولنے والے سندھی یعنی مہاجر جن کی سب سے بڑی سیاسی جماعت ایم۔ کیو۔ ایم۔ نے ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں علاحدہ قومیت کی بنیاد پر کراچی، حیدر آباد، میر پور خاص اور نواب شاہ وغیرہ کے علاقوں سے وفاقی اور سندھ اسمبلی کے لیے مختص نشستوں کی اکثریت پر انتخاب جیتنے اور خود کو مہاجر کہلوانا پسند کیا۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۰ء کے انتخابات تک پہنچتے پہنچتے اس لفظ مہاجر یعنی اردو بولنے والے لسانی گروہ کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھا گیا، اس کی تفصیلات متعدد کتابوں میں تفصیلاً درج ہیں۔ میں یہاں صرف ایک مثال جو ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اپنی خود نوشت میں درج کی، پیش کرنا چاہوں گا تاکہ اس بات کا اندازہ لگایا جا سکے کہ پچاس کی دہائی میں ہی جب کہ ایم۔ کیو۔ ایم۔ جیسی لسانی جماعت کا وجود تک نہیں تھا اردو بولنے والی عام آبادی تو درکنار ان کے دانش وروں اور اہل قلم کے ساتھ کیا رویہ روا رکھا جاتا تھا۔ اس کا اظہار اس زمانے کے اہلِ علم نے بھی اپنی تصانیف میں کیا ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے مطابق:

> وہ سب سختیاں دیکھ لیں جو ہجرت، ترکِ وطن، پناہ گیری، آپ جس نام سے چاہیں یاد کر لیں۔ اس وقت بلوچستان میں مہاجرین کو "پناہ گیرا" کے معزز لقب سے سرفراز کیا گیا تھا...اس کے بعد...لاہور... ترک مکانی یا نقل مکانی تھی...اسباب ایسے ہو گئے کہ میں اس فیصلے پر مجبور ہوا، ان کے بیان میں اب کوئی فائدہ نہیں[۵]۔

ظاہر سی بات ہے یہ مسلم اردو بولنے والے دانش ور اور بیورو کریسی کے افسران یوں ہی ہجرت کر کے نہیں آئے بلکہ قیام پاکستان کے اعلان کے بعد مسلم لیگی قیادت نے نئے ملک کی انتظامی ذمے داریوں کو سنبھالنے کے لیے حکومت ہند کے مسلمان افسروں اور اہل کاروں کو یہاں آنے کی ترغیب دی تھی۔ مسلمان عملے کے ارکان اور حکام نے کچھ تو پاکستان دوستی کے روایتی جذبے کے تحت اور کچھ ہندوستانی حکومت کی ناانصافیوں کے خوف سے یہاں آنا شروع کر دیا۔ اہل کاروں کے ساتھ کنبہ، پاس پڑوس، برادری اور خاندان کے خاندان کو ترغیب دی تو یو۔ پی۔ بہار، سی۔ پی۔ اور جنوبی ہند سے لاکھوں کی تعداد میں مہاجرین سندھ میں بس گئے۔ ابتدا میں بد گمانی نے جنم نہیں لیا لیکن کراچی کی علاحدگی کے بعد دلوں میں میل آنے لگا۔ جن پرانے سندھیوں کو یہ امید تھی کہ ہندو مہاجنوں سے واپس ملنے والی اراضی ان کے اصل مالکوں کو واپس کر دی جائے گی، ان کی یہ امید کبھی پوری نہ ہوئی بلکہ اس کے برخلاف جھوٹے سچے کلیم کے دعوے داروں کو یہ سرکاری اراضی بانٹ دی گئی۔ مزید یہ کہ قیام پاکستان کے فوری بعد ملازمتوں کا جو خلا پیدا ہوا تھا، اسے پُر کرنے کے لیے پرانے سندھیوں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی بے حد کمی تھی۔ نتیجتاً

ملازمتوں کی منڈی میں بھی مہاجروں کے ساتھ پنجابیوں کی آمد تو شروع ہوئی لیکن کافی عرصے تک سندھی نوجوان اس دوڑ میں پیچھے رہا۔

ون یونٹ اور اس کے بعد ملک میں لگنے والے پہلے مارشل لانے بھی جو تباہی مچائی اس کی تفصیلات اندوہ ناک ہے۔ جمہوری اور سیاسی اداروں کی سرگرمیوں کے نتیجے میں آبادی کے مختلف حصوں کو ایک دوسرے کے ساتھ گھلنے ملنے کا جو موقع ملنا چاہیے تھا، وہ ختم ہو گیا۔ وفاقی دارالحکومت کو اس کے تمام ملازمین سمیت جن میں مقامی لوگوں کی کثیر تعداد تھی، اسلام آباد پہنچا دیا گیا۔ ملازمتوں میں کوٹا سسٹم نافذ کر کے نئے اور پرانے سندھیوں میں مزید دوریاں اور نفرت کی دیوار کھڑی کی گئی۔ صوبہ پنجاب میں صنعتی سرگرمیوں کو شروع کرنے کے بجائے وہاں کی بڑی آبادی کی منتقلی نے بھی نئے مسائل کو جنم دیا۔ نتیجتاً سندھ کے قوم پرستوں نے یہ نعرہ تک لگانا شروع کر دیا کہ ''ہمیں سندھ میں صنعتی ترقی نہیں چاہیے''[۵۲]۔ کراچی کو سیاسی طور پر تباہ کرنے اور یہاں کے لوگوں کو آپس میں لڑانے کی کوششیں اس وقت شدت اختیار کر گئیں جب ایوب خان محترمہ فاطمہ جناح کے خلاف صدارتی انتخاب اخلاقی طور پر ہارنے کے تحت دارالحکومت کو بہ حفاظت اسلام آباد لے جانے میں کامیاب ہوگئے۔ انھیں کراچی میں ہر طرف دہشت گرد ہی نظر آتے تھے۔ ۱۹۵۵ء میں ایوب خان نے متعدد فیصلے کیے جنھوں نے کراچی اور پاکستان کے بقیہ حصوں کے ساتھ اس کے تعلقات پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ گریٹر کراچی ری سیٹلمنٹ پلان کے تحت ایک یونانی کمپنی کو ایسا منصوبہ تیار کرنے کا حکم دیا گیا جس کے مطابق دو نئی بستیاں لانڈھی، کورنگی اور شمال کی طرف نیو کراچی کو آباد کرنا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ تمام مہاجر بستیاں ناجائز قرار دی گئیں جن میں لوگ اپنے رہائشی مکانات تعمیر کر چکے تھے۔ اندرونِ شہر مہاجر بستیوں اور غیر قانونی آبادیوں کو مسمار کر دیا گیا۔ دور دراز مقام پر قائم ان نئی بستیوں کے درمیان خشک قدرتی نالوں کے کنارے دلالوں نے کچی آبادیاں بنانی شروع کر دیں۔ رفتہ رفتہ غریبوں کو رہائشی زمین فراہم کرنے والے یہ آڑھتی اس شہر کے طاقت ور مفاد پرست گروہ بن گئے۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے اور ان پر کسی قسم کی قانونی قدغن نہیں۔ اس صورتِ حال نے گنجان آباد شہر کو دور دور تک بکھری ہوئی پس ماندہ بستیوں کے مجموعے میں بدل دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غریب شہری، شہر سے دور ہو گئے۔ اُمرا نے مرکزِ شہر سے ملحق آبادیوں میں بہترین طرزِ رہائش اختیار کر لی۔ کراچی میں آج جو نسلی مسائل نظر آتے ہیں، عارف حسن کے مطابق ان میں سے زیادہ تر مسائل گریٹر کراچی پلان کے نتیجے ہی میں پیدا ہونا شروع ہوئے[۵۳]۔

سندھ میں قومیت کے شعور کو پروان چڑھانے، صوبائیت اور علاقائیت کے رجحانات کو فروغ دینے میں جی۔ایم۔ سید، پیر علی محمد راشدی اور ابراہیم جویو کے کردار کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ سندھ کی لسانی اور علاقائی تحریک کو فکری

غذا دینے اور اس تحریک کو سندھ دیش کے لیے استعمال کرنے کی اصل محرک جی۔ ایم۔ سید کی ذات ہے۔ جی۔ ایم۔ سید نے ۷۲ سال کے اندر تین درجن سے زائد کتابیں لکھیں۔ ان کی بعض کُتب مثلاً ''سندھو دیش کیوں اور کس لیے'' اور ''دیارِ دل و داستانِ محبت'' وغیرہ جیسی کتابوں کو بھارت میں چھپوا کر سندھ میں تقسیم کیا گیا۔ انھوں نے اپنی تصانیف میں جن امور کو پیش نظر رکھا ان میں اسلام کے انقلابی تصور پر تابڑ توڑ حملے کیے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کہ اسلام کا یہ تصور محض سندھیوں کے استحصال کے لیے گھڑا گیا ہے۔ سندھو دیش کا قیام اور نوجوانوں کو اس جانب راغب کرنا، سندھی قوم پرستی کے جذبات کو ابھار کر علاقائی سیاست کو فروغ دینا وغیرہ اہم ہیں۔ ۳۱ مارچ ۱۹۷۳ء کو سندھ یونی ورسٹی میں کی گئی ان کی تقریر کو کئی رسائل نے متعدد بار شائع کیا۔ اس تقریر میں کھل کر ملک کے خلاف، دو قومی نظریے کے خلاف، سندھو دیش کی حمایت میں اور مہاجر اور پنجابی گٹھ جوڑ کے خلاف انھوں نے زہر اُگلا۔ انھوں نے دوٹوک الفاظ میں سندھی نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ یہ مہاجر اور پنجابی ہی ہیں جو مستقل سندھیوں کا استحصال کر رہے ہیں۔ ہماری اقتصادیات پر قابض ہیں، ہمارے کلچر پر غالب ہیں۔ اس کے سدباب کے لیے ہمیں غور و فکر کرنا ہے[۵۴]۔

اس سے قبل فروری ۱۹۷۲ء کو ذوالفقار علی بھٹو کے سامنے وہ اپنا ۲۷ نکاتی ایجنڈا بھی پیش کر چکے تھے جس میں قراردادِ لاہور کے بارے میں اپنی تاویل پیش کرتے ہوئے آزاد اور خود مختار ریاست کے قیام پر زور دے کر سندھ کی علاحدگی پر زور دیا تھا۔ ان نکات کو سندھی زبان میں بڑی تعداد میں چھپوا کر لوگوں میں تقسیم کیا گیا۔ ابتدا میں ان نکات کو ہفت روزہ ندائے سندھ حیدر آباد نے اپنی ۲۵ اپریل کی اشاعت میں شامل کیا[۵۵]۔ یہ وہ عمل تھا جس نے سندھ میں علاحدگی پسندی کے رجحان کو خوب فروغ دیا۔ ظاہر سی بات ہے کہ جی۔ ایم۔ سید اور ان کے پروردہ شیخ ایاز نے اعلانیہ الحادی کلمات بھی کہے اور ملک دشمنی کی باتیں کر کے اس کو خوب فروغ دینے کی کوشش بھی کی۔ آزاد بن حیدر نے اپنی ایک تصنیف میں ان کے نظریات و خیالات کا محاکمہ کیا ہے اور کھل کر ان کی گمراہیوں کا پردہ چاک کیا ہے[۵۶]۔ جی۔ ایم۔ سید نے سندھ متحدہ محاذ قائم کر کے سندھ کو مہاجر، پنجابی اور پٹھانوں یعنی تمام غیر سندھیوں کو سندھ سے نکالنے کی بات کی تو ان ملک دشمن ایذا رسانیوں سے بچنے کے لیے سندھ مہاجر، پنجابی، پٹھان متحدہ محاذ کے نام سے ۱۴ اکتوبر ۱۹۶۹ء کو نواب مظفر حسین خان کی سربراہی میں ایک جماعت بھی قائم ہوئی۔ انتخابات میں جی۔ ایم۔ سید کو بدترین شکست ضرور ہوئی اور بھٹو کو سندھ میں واضح کامیابی ملی لیکن جی۔ ایم۔ سید کا یہ دعویٰ کہ ''اب اسی کی حکومت ہوگی''[۵۷] رفتہ رفتہ صحیح ثابت ہوا۔ بھٹو نے اس کے خواب کی تکمیل کی راہ ہموار کی۔ شیخ ایاز کی وائس چانسلر کی تقرری سے لے کر لسانی بل تک کے معاملات میں بھٹو، جی۔ ایم۔ سید کے ہم نوا نظر آتے ہیں۔ ۱۸ جنوری ۱۹۷۲ء کو دادو کے گاؤں سن

میں آزاد سندھودیش تحریک اور خدام سندھ نامی گوریلا فوجی تنظیم کی داغ بیل ڈالی گئی۔اقبال ترین نے واشگاف الفاظ میں اعلان کیا کہ ہم بنگلا دیش کے نقشِ قدم پر چل کر سندھ کو آزاد کرالیں گے۔ کسی نے اس راہ میں رکاوٹ ڈالی تو دریائے سندھ کو خون سے سرخ کر دیا جائے گا۔ پیپلز پارٹی کی حکومت کے قیام کے بعد سندھ میں جی۔ایم۔سید کی فتح کے جھنڈے لہرانے لگے۔ سندھ یونی ورسٹی جام شورو میں غیر سندھی طلبہ کی پٹائی اور لوٹ مار روز کا معمول بن گیا۔ کراچی میں مزدوروں پر گولیاں برسائی جانے لگیں۔ ڈومیسائل کا حصول غیر سندھیوں کے لیے ناممکن بنا دیا گیا۔ سندھی کو سندھ کی واحد قومی زبان بنانے کے اعلانات نے مزید بگاڑ پیدا کیا۔ غیر سندھی کاشت کاروں کی زمینوں پر زبردستی قبضے کیے جانے لگے۔ سندھ یونی ورسٹی کے غیر سندھی اساتذہ کے گھروں کو لوٹنے کے علاوہ ان کو بہیمانہ تشدد کا بھی نشانہ بنایا گیا۔ کالج اساتذہ کو قتل کیا گیا۔ اس کی ایک مثال گورنمنٹ کالج سکھر کے پروفیسر عباس بن عبدالقادر کی ہے جنھیں ۲ ستمبر کو گولیاں برسا کر خیر پور میرس کے مقام پر شہید کر دیا گیا۔ لاڑکانہ میں گورنمنٹ کالج کے پرنسپل پروفیسر شبیہ حیدر کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ سندھ کے میڈیکل، انجینئر نگ کالجوں اور دیگر ٹیکنکل تعلیمی اداروں میں طلبہ کو داخلوں سے زبردستی روکا جاتا۔ ان کو جسمانی اور جنسی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا۔ اس زمانے کے قومی اخبارات ان واقعات سے بھرے ہوئے ہیں[۵۸]۔

بھٹو اور جی۔ایم۔سید سمیت بے شمار سندھی رہنماؤں، وزیروں اور مشیروں نے اردو اور سندھی اختلافات کو ہوا دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ ۱۳ جون ۱۹۷۲ء کو اندرونِ سندھ اردو میں لکھے گئے تمام سائن بورڈ اور ناموں کی تختیاں زبردستی اتار دی گئیں یا توڑ دی گئیں۔ سندھودیش کے لیے باقاعدہ مہم چلانے والے رسائل میں سوہنی، تحریک، پیغام اور جدوجہد وغیرہ سرفہرست ہیں۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ان اخبارات ور سائل میں غیر سندھیوں کے خلاف وہ سندھی اکابرین بھی لکھتے رہے جن کا علمی مرتبہ کافی بلند تھا۔ اسلام، پاکستان اور غیر سندھیوں کے خلاف لکھنے والوں میں جی۔ایم۔سید، شیخ ایاز کے علاوہ عبدالواحد اریسر، طارق اشرف، امر جلیل، سراج الحق میمن، ابراہیم جویو، فولاد خان (عبدالوحید صدیقی)، ابراہیم منش، شاہ محمد شاہ، مدد علی سندھی، مولا بخش لغاری، شوکت سندھی، نجم عباس، پیر حسام الدین راشدی، میر امداد علی، حفیظ قریشی، ضمیر لاڑک، ایاز قادری، عبدالکریم گدائی، عثمان ڈیلائی، شیخ علی محمد اور غلام محمد گراہی وغیرہ پیش پیش تھے۔ اس زمانے کے قومی و صوبائی اسمبلی کے بعض ارکان بھی انھیں نظریات کو نہ صرف فروغ دے رہے تھے بلکہ عملی جدوجہد میں بھی شامل رہے۔ ان باتوں کے واضح شواہد موجود ہیں کہ پاکستان پیپلز پارٹی جیسی قومی جماعت جس کی حمایت پنجاب میں بے حد زیادہ تھی، درپردہ جیے سندھ کے نظریات کی آلہ کار بنی رہی۔ پیر محمد علی راشدی جیسے سندھی مفکرین تو کھلم کھلا یہ بات کہتے تھے کہ اب تک سندھ انگریز کا غلام تھا لیکن اب

پنجاب کا غلام بن جائے گا اور اہلِ پنجاب سندھ کا بچا کھچا خون بھی چوس لیں گے۔ ان کے مضامین کا مجموعہ فریادِ سندھ کے نام سے شائع ہوا۔ یہ ان مضامین پر مشتمل ہے جو اخبار قربانی میں تسلسل کے ساتھ شائع ہوتے رہے۔ ان میں سے بعض مضامین کو ہندوؤں نے اپنے مفاد میں استعمال کرنے کے لیے انگریزی ترجمہ کر کے سندھ آبزرور میں قسط وار شائع کروایا۔ انھوں نے اپنی کتاب سندھ کے سیاست دانوں کی سچی تصویر میں پنجابی تسلط اور سندھ کی معیشت پر ان کے قبضے پر بہت زوردار انداز میں آواز بلند کی۔

اسی طرح کئی اخبارات اور رسائل ایسے مضامین بھی چھاپتے جن میں انھیں پناہ گیر وغیرہ کے القاب سے نوازا جاتا۔ رسالہ سہ ماہی مہران ہی میں ایک مضمون شائع ہوا جس میں ایک ہندو مضمون نویس کشور جیون نے لکھا کہ :

> ہر جگہ پناہ گیر چھائے ہوئے ہیں۔ جدھر دیکھو پناہ گیر ہی پناہ گیر نظر آتے ہیں۔ اگر قانون نے ہماری مدد نہیں کی تو ہم دوسرے طریقوں سے پناہ گیروں کو مار بھگائیں گے [۵۹]۔

بھارت سے سندھی میں شائع ہونے والے رسائل اور جرائد بھی سندھ میں بڑی تعداد میں تقسیم کیے جاتے۔ ہفت روزہ پشت بھوی جو اندور سے شائع ہوتا تھا۔ اس نے ۱۴ مئی ۱۹۶۷ء کے شمارے میں لکھا کہ :

> سندھ کے اندر سندھی مسلمانوں میں سندھ قومیت کا جو عمدہ جذبہ پیدا ہوا ہے، اس نے سندھ کی پاک سرزمین کو ایوب شاہی ناپاک ہاتھوں سے پاک کرنے کا راستہ ہموار کر دیا ہے۔ سندھی مسلمان اس وقت خود کو خالص سندھی سپوت تصور کرتے ہیں اور غیر سندھی مسلمانوں کے مظالم نے اب ان کی آنکھیں کھول دی ہیں [۶۰]۔

اس زمانے میں اس ملک کی بیوروکریسی کا حصہ بننے والے متعدد اہل قلم نے اپنی تصانیف میں جس قسم کے خیالات کا اظہار کیا وہ ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔ کراچی انتظامیہ کے منتظم ہاشم رضا نے اپنے سرکاری نوٹ مورخہ ۶ فروری ۱۹۵۱ء کو کراچی کی انتظامیہ کی کارکردگی کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھا کہ اس زمانے میں عوامی بہبود کا وہ تمام کام جو بالعموم شہری انتظامیہ کو انجام دینے چاہیے تھے، مسلسل نظرانداز ہوتے رہے اور مقامی انتظامیہ میں افسران کا ایسا حلقہ پیدا ہوتا چلا گیا جو وزرا، سفرا اور سیاست دانوں سے تعلقات عامہ قائم رکھنے کو اپنے فرائضِ منصبی پر ترجیح دیتا تھا [۶۱]۔ پاکستان میں اس کے قیام کے زمانے سے ہی افسر شاہی نے جو کھیل کھیلا، اس کا کچا چٹھا بڑی حد تک متعدد کتابوں میں شائع ہو چکا ہے۔ ایک طرح سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سول اور ملٹری بیوروکریسی نے شروع سے ہی اقتدارِ اعلیٰ پر نظریں گاڑھی ہوئی تھیں اور بڑی حد تک حکومتوں کو یرغمال بنا رکھا تھا۔ پاکستان کے ابتدائی زمانے کے ایک سینئر بیوروکریٹ شہاب الدین رحمت اللہ جن کا تعلق صوبۂ بہار سے تھا، وہ قیام پاکستان کے بعد ڈھاکا کے پہلے

ڈپٹی کمشنر بھی مقرر ہوئے، ۱۹۵۶ء میں کراچی میں سیکریٹری کے عہدے پر ریٹائرڈ ہوئے، اپنی خود نوشت شہاب بیتی میں لکھتے ہیں کہ:

> پاکستان میں صحت مندانہ اور منصفانہ سیاست شہید ملت نواب زادہ لیاقت علی خان مرحوم کے بعد کبھی وجود میں نہ آسکی کیوں کہ سیاسی لیڈروں اور نوکر شاہی کے درمیان اقتدار کی جنگ شروع ہوگئی ... حکمراں، نوکر شاہی اور خود ساختہ سربراہ مملکت کے لیے من مانی کرنے کا میدان صاف ہوتا گیا اور کھلی بد عنوانی، ناانصافیوں، سازشوں اور تشدد کی راہیں ہم وار ہوتی گئیں۔ نوکر شاہی کے چند اراکین اپنی چال بازیوں کے ذریعے بہت سے اہم محکموں اور علاقوں میں برسرِ اقتدار آئے تو انھوں نے ذاتی مفاد کے مد نظر انتظامیہ کے ایمان دار اور ... کارآمد افسران کو اکھاڑ پھینکنے کی مہم چلائی... لسانی اور صوبائی تعصبات کی سرپرستی اپنے مفاد میں کی... انصاف کی جگہ حق تلفیوں کو اپنا نصب العین بنایا... سول سروس اور پولیس میں ایسے افسران کا چناؤ ملک کے اہم ترین عہدوں پر ہوتا رہا جن کا کوئی قابل ذکر ملازمتی کارنامہ ہندوستان میں نہ تھا[۴۲]۔

مذکورہ اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پاکستان کی بیوروکریسی ابتدائی ایام سے ہی کن خطوط پر استوار رہی۔ خصوصاً پولیس سروس اور شہری انتظامیہ میں نااہل افسروں نے رشوت اور اقربا پروری کا جو بازار گرم کیا، اس نے کراچی میں رہنے والے اردو بولنے والی آبادی میں احساسِ محرومی میں بہت زیادہ اضافہ کیا۔ مملکت کے اندر ہونے والے اس سازشی ڈرامے کے کردار صرف بیوروکریسی ہی نہیں بلکہ موقع پرست سیاست دان، چاپلوس زمین دار، جاگیر دار، وزیر، سفیر، صنعت کار اور صحافی سب ہی اس کھیل کے برابر کے شریک تھے۔ لڑاؤ اور حکومت کرو کی اس پالیسی کو جو انگریزوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں میں دوریاں پیدا کرنے کے لیے اختیار کی تھی، صوبائیت اور لسانیت کی آگ میں جھونک کر اسی عمل کو مقامی سطح پر پھر سے دہرایا جارہا تھا۔ سندھ کے بیش تر مسائل اسی بیوروکریسی اور موقع پرست سیاست دانوں ہی کے گھناؤنے اشتراکی عمل کا نتیجہ رہے ہیں اور یہ ان ہی کے بوئے ہوئے زہریلے بیج ہیں جن کی فصل باشندگانِ سندھ اب تک کاٹ رہے ہیں[۴۳]۔ سندھ کی دیہی اور شہری آبادی کے درمیان آج جو دوریاں نظر آتی ہیں، ظاہر سی بات ہے کہ اس کا بیج بھی قیام پاکستان کے ابتدائی زمانے میں ہی بویا جاچکا تھا۔ افسوس کہ ہجرت کی تاریخ میں یہی ایک مثال ہے کہ نئی آبادی پرانوں کو جاہل، مفلس، اچھوت تصور کرنے لگی۔ اپنے آپ آریا تہذیبی تمدنی لحاظ سے اونچا سمجھ کر الگ کھچڑی پکانے لگی[۴۴]۔ سندھی قوم پرستی کے سیاسی لٹریچر نے نئے آنے والے اس گروہ کو

جواب اس نوزائیدہ مملکت کو اپنا وطن سمجھنے لگا تھا، مہاجر اور پناہ گیر کے القابات سے نوازا[۶۵] تو دوسری جانب خود ان نئے آنے والوں سندھیوں نے بھی سندھ کے قدیم باشندوں کے مسائل پر بالکل توجہ نہ دی۔ وہ غریب کچلا ہوا سندھی جس کے مسائل کسی طرح بھی نئے سندھیوں سے کم نہ تھے بلکہ بعض صورتوں میں ان سے کہیں زیادہ ہی تھے، ان کے سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل کو اردو شعرا نے درخورِ اعتنا نہیں جانا اور ایک طرح سے سندھیوں کے ان معاملات سے مجرمانہ خاموشی برتی گئی۔ ظاہر سی بات ہے قیامِ پاکستان کے زمانے کے خوں چکاں فسادات، لاکھوں انسانوں کے قتلِ عام، آبائی علاقوں سے کروڑوں انسانوں کی جبری ہجرت، نہایت بے سرو سامانی کی عالم میں دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کا قیام، نئی مملکت کے محض تیرہ مہینوں کے اندر ہی قائدِ اعظم کی وفات اور مسلم لیگ کا زوال، لیاقت علی خان کا وحشیانہ قتل، عوامی قیادت کا انتشار، صوبائی رقابتیں، مہاجرین کے مسائل، نئے پاکستانیوں کی محرومیاں اور مایوسیاں، متروکہ جائیداد کے دعوے، جائز و ناجائز الاٹمنٹ کا سلسلۂ دراز، فرقہ پرستی اور ترقی پزیر ہونے جیسے نعرے وغیرہ نے[۶۶] ان شعرا کو مقامی سندھیوں کی طرف دیکھنے سے غافل رکھا۔ وہ زمانہ سخت ہیجان و اضطراب کا زمانہ تھا۔

(۲)

اس زمانے کی واضح جھلک اگر دیکھنی ہو تو رئیس امروہوی (۱۹۱۴۔۱۹۸۸) کی شاعری اس کی بہترین مثال ہیں۔ ان کے قطعات میں جابجا ان گہرے پرشور طوفانی ہیجانات کی جھلکیاں نظر آئیں گی۔ ہندو مسلم فسادات کے بعد برصغیر میں جس قسم کی سیاسی صورتِ حال تھی، اس کا اظہار کرتے ہوئے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کے ایک قطعے میں رئیس امروہوی کہتے ہیں کہ:

بر کو چک خوف اور نفرت کا گہوارہ ہوا   دامنِ امن و اماں صد چاک و صد پارہ ہوا
دیکھنا انگریز کی منصوبہ بندی کا کمال   ہند پاکستان سکھ تینوں کا بٹوارا ہوا[۶۷]

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ قیامِ پاکستان کے بعد اردو بولنے والوں پر سندھ کا یہ بڑا احسان ہے کہ اس صوبے نے نئے سندھیوں کو ایک خطۂ زمین فراہم کیا۔ اندرونِ سندھ آباد نئے سندھیوں نے اپنے آپ کو سندھ کے ماحول سے مانوس کرنا شروع کر دیا تھا اور معاشرتی سطح پر باہمی اخوت، تعاون اور اشتراک کی فضا قائم ہونے لگی تھی۔ یہ سازگار فضا ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۴ء تک برقرار رہی۔ سندھ میں ایک دو لسانی مخلوط تہذیبی معاشرہ ظہور پانے لگا تھا۔ مختلف خاندانوں کے درمیان رشتے ناتے بھی جڑنے لگے تھے لیکن اس پرسکون فضا میں بعض مہاجر خود ساختہ رہنماؤں

کی جاہلانہ احساسِ برتری اور دوسری جانب سندھی قوم پرستی اور تنگ نظری کے ساتھ ساتھ دونوں جانب سے متعصبانہ بیان بازیوں نے وہ ارتعاش پیدا کیا[۶۸] جو آج تک تھمنے کا نام نہیں لیتا۔ ابتدا میں یہ مہاجرین جب کراچی میں آ کر بسے تو کراچی کسی مسائلستان سے کم نہ تھا۔ ۱۶ فروری ۱۹۴۸ء کے ایک قطعے میں رئیس امروہوی اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ :

کس نے کہا کہ شہرِ کراچی میں آج کل
کچھ بھی نہیں ہیں زہرِ مصیبت کے گھونٹ ہیں
کس چیز کی کمی ہے ہمارے دیار میں
مفلس ہیں، اہلِ زر ہیں، مہاجر ہیں، اونٹ ہیں[۶۹]

نئے آنے والے سندھیوں کی آبادکاری کے جو مسائل کراچی اور پورے سندھ کو درپیش رہے، ابتدائی زمانے سے ہی رئیس امروہری کے ہاں اس کا اظہار ملتا ہے۔ قطعہ ملاحظہ کیجیے :

کیا خوب اک بزرگ کو میں نے دیا جواب — آئے تھے دور سے جو تمنائے سندھ میں
حضرت کو ہے ابھی سے ٹھکانے کی آرزو — کچھ روز بلبلایئے صحرائے سندھ میں[۷۰]

ظاہر سی بات ہے جن چھے لاکھ مہاجروں نے کراچی میں دھاوا بولا وہ شہر کی تمام کھلی جگہوں اور یہاں سے جانے والے ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی عمارتوں پر قابض ہوگئے۔ یہ مہاجر آبادیاں مختلف طبقات اور مختلف نسلوں پر مشتمل تھیں۔ دانش ور، فن کار، شاعر، اداکار اور مزدور پیشہ لوگ سب کے سب ایک ساتھ صدر بازار سے چند قدم کے فاصلے پر رہتے تھے۔ قیامِ پاکستان کے چار برس کے اندر ہی کراچی ایک انوکھی اور وسیع المشرب ثقافت کے ساتھ مختلف طبقات پر مشتمل ایک گنجان آباد شہر بن گیا[۷۱]۔ اسی لیے رئیس امروہوی سمیت متعدد شعرا نے اس شہر کی خوب صورتی اور عظمت کے گیت بھی گائے۔ ۱۹ فروری ۱۹۴۸ء کو انھوں نے کراچی کو جنت سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا کہ :

جلوۂ صبحِ بنارس منظرِ شامِ اودھ — ہم کو ہر دولت کراچی کی بدولت مل گئی
ہر قدم صد حسن و جلوہ ہر نفس صد رنگ و بو — ہم نے پاکستان مانگا تھا سو جنت مل گئی[۷۲]

رئیس امروہری نے کراچی کے مسائل کو ایک الگ ہی نظر سے دیکھا۔ صحافت سے وابستہ رہنے کی وجہ سے وہ اس شہر میں ہونے والے روز مرہ مسائل سے پوری طرح واقف تھے۔ اس زمانے کی سیاست اور معیشت پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ معاشیات کے موضوع پر ان کا مضمون انسان اور لامحدود وسائل[۷۳] خاصے کی چیز ہے۔ اس

مضمون سے ہم معاشی امور میں رئیس امروہوی کی بصیرت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ لیکن ان کا اصل میدان سیاسی اور سماجی موضوعات کا گہرا فہم و ادراک ہے۔ انھوں نے کراچی کے سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل کے بارے میں نہ صرف شاعری کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار کیا بلکہ اپنے کالموں کے ذریعے حکومتِ وقت کو اس شہر کے مسائل اور ان کے حل کی طرف توجہ دلائی۔ اس بابت کالم ''کراچی نامہ'' خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ''کراچی نامہ'' کے عنوان سے پہلا کالم یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا[۴۴] شائع ہونا شروع ہوا تو لوگوں نے ان کالموں کو خوب سراہا۔ یہ کالم دراصل اس شہر کے حوالے سے رئیس امروہری کی جانب سے کی جانے والی شاعری کی وضاحت ہے۔ ان کالموں میں شہر کے حوالے سے کی جانے والی شاعری کے پیرامیٹرز بتاتے ہوئے وہ خود کہتے ہیں کہ :

> یوں تو اس شہرِ عظیم الشان کا ہر شخص خود ایک مسئلہ ہے لیکن چاروں وزرائے کرام چار روز کی تحقیق و تدقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کراچی کے بنیادی دیو زاد مسئلے صرف چار ہیں۔ آبادکاری کا مسئلہ، پانی کا مسئلہ، صفائی کا مسئلہ اور ٹریفک کا مسئلہ[۴۵]۔

دل چسپ اور افسوس کی بات یہ ہے کہ ۱۹۶۷ء میں لکھے گئے اس کالم میں کراچی کے جن مسائل کی نشان دہی کی گئی ہے وہ نصف صدی کے بعد بھی جوں کے توں ہیں بلکہ ان میں قدرے اضافہ ہو رہا ہے۔ اہم بات تو یہ ہے کہ اس شہر کے وسائل پر تو سب نے ہی اپنا حق جتایا لیکن اسے حقیقی معنوں میں اپنا شہر سمجھنے میں تمام ہی طبقہ ہائے فکر نے تنگ نظری سے کام لیا۔ ابتدا میں جو مہاجرین یہاں آ کر بسے وہ بھی خود کو عرصۂ دراز تک دہلوی، لکھنوی، الہ آبادی، بہاری، مرادآبادی، یوپی، سی پی وغیرہ وغیرہ کہہ کر اپنی شناخت کے گورکھ دھندوں میں الجھے رہے جو رفتہ رفتہ مکڑ، مٹروے، پناہ گیر سے ہوتا ہوا لفظ ''مہاجر'' کی تان پر ختم ہوا اور بلآخر یہی لفظ ان نئے سندھیوں کی شناخت ٹھہرا۔ بعد میں دارالحکومت ہونے کی وجہ سے جن بڑے لسانی گروہ کا اس شہر پر غلبہ رہا وہ بھی خود کو سرائیکی، پنجابی، ہزارے وال اور پختون کی حیثیت سے اپنی علاحدہ شناخت پر اصرار کرتے رہے۔ پروین شاکر نے شہر کے ساتھ ہونے والے اس سلوک پر شدید غم و غصے کا اظہار کیا۔ اپنی نظم کراچی میں انھوں نے اس شہر کو طوائف سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا کہ جس طرح بازار میں ان طوائفوں کے ساتھ سلوک ہوتا ہے، یہاں سے اپنی معاشی ضروریات پوری کرنے والے لوگ شہر کے ساتھ اسی طرح کا سلوک روا رکھے ہوئے ہیں۔ اس نظم میں ان کا غم و غصہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ :

> کراچی / ایک ایسی بیسوا ہے / جس کے ساتھ / پہاڑوں، میدانوں اور صحراؤں سے آنے والا / ہر سائز کے بٹوے کا آدمی / رات گزارتا ہے / اور صبح اٹھتے ہی / اس کے داہنے رخسار پر / ایک تھپڑ

رسید کرتا ہے/اور دوسرے گال کی توقع کرتے ہوئے/کام پر نکل جاتا ہے/اگلی رات کے نشے

میں سرشار![46]

کراچی کے ساتھ یہ رویہ کوئی نیا نہیں بلکہ قیام پاکستان کے ابتدائی زمانے سے ہی یہاں کے باسیوں کا یہی وتیرہ رہا۔ رئیس امروہوی نے ۴مارچ ۱۹۴۸ء کے ایک قطعے میں بھی اس جانب اشارہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

ہم کو ملا ہے شہر کراچی نصیب سے چھینکا جو گر پڑا ہے تو بلی کے بھاگ ہیں
جس جس سے ہم یہاں پہ ملے یہ پتا چلا یہ "بمبئ" کے سیٹھ یہ "دلّی" کے گھاگ ہیں[47]

اپنے ایک اور قطعے میں انھوں نے طنزاً کہا ہے کہ:

یہ ذکر تھا کہ فخرِ کراچی ہیں کون لوگ اک رہ نمائے قوم پکارا کہا کہ ہم
اک شوخ نازنیں بھی گزرتی تھی راہ سے برقع الٹ کے اس نے اشارہ کیا کہ ہم[48]

قومی شناخت اور تشخص کے مسئلے نے مہاجر نوجوانوں کو قیام پاکستان کے ابتدائی زمانے سے ہی شدید قسم کے احساسِ محرومی اور جھنجلاہٹ سے دوچار رکھا۔ ایک خاص حصہ ٔ آبادی کے خلاف متعصبانہ کارروائیوں نے اس جھنجلاہٹ کو اور ہوا دی۔ بلاشبہ پاکستان کے ابتدائی برسوں میں معاشی اور سیاسی حالات کا رخ نسبتاً مہاجروں کے حق میں رہا۔ وہ جب لٹے پٹے یہاں آئے تو سندھی عوام نے کھلے دل اور کشادہ بازوؤں کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ سول اور فوجی بیوروکریسی میں بھی اس وقت اچھا خاصا حصہ ان مہاجروں کے حصے میں آیا۔ اگر دیکھا جائے تو اس نوزائیدہ مملکت کی باگ دوڑ ہی ہندوستان سے آئے ہوئے آئی۔ سی۔ ایس افسران کے ہاتھوں میں تھی۔ وفاقی اور صوبائی محکموں میں ان کی اچھی خاصی کھپت تھی۔ صنعت و حرفت اور تجارت کے میدان میں بھی انھیں خاص مسابقت کا سامنا نہ تھا۔ ہندوؤں کے جانے کے بعد تجارت میں جو خلا پیدا ہوا تھا، بڑی حد تک مہاجر تاجروں نے اسے پورا کیا۔ جب کہ ان مہاجروں کو شروع سے ہی نہایت کٹھن حالات اور دشواریوں کا سامنا تھا اور ان دشواریوں اور چیلنجوں سے نبٹنے کے لیے ان کے پاس صرف اور صرف ایک ہی راستہ تھا "محنت اور انتہائی محنت" اور انھوں نے بڑی حد تک اپنی محنت اور جدوجہد سے حالات کو اپنی موافقت میں ڈھال بھی لیا اور اپنی پوری صلاحیتوں سے اس نوزائیدہ مملکت میں اپنا مستقبل سنوارنے اور اس مملکت کی تعمیر و ترقی میں مصروف ہوگئے۔ اپنی جدوجہد اور کوشش سے ہر مشکل کا مقابلہ ان لوگوں نے کر کے دکھایا۔ لیکن یہ صورتِ حال زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکی۔ ایوب خان، یحییٰ خان، ذوالفقار

علی بھٹو ضیاالحق کے عہد میں سول اور فوجی بیورو کریسی کی تطہیر کے نام پر مہاجر افسران کو چن چن کر ملازمت سے نکالا جانے لگا جس کے نتیجے میں مہاجروں کے اندر شدید احساسِ ہزیمت و بے بسی پیدا ہوا[79]۔

تاریخ شاہد ہے کہ وادیِ مہران اپنے ابتدائی ایام سے ہی مختلف تہذیبوں، ثقافتوں، نسلوں اور قبیلوں کی آماج گاہ رہی ہے۔ موجودہ سندھ کو اس اعتبار سے بھی فوقیت حاصل ہے کہ یہاں مختلف نسلوں، قبیلوں، بولیوں اور تہذیبوں کے حامل گروہ کئی کئی نسلوں سے مستقل طور پر آباد ہو چکے ہیں۔ وہ اپنی جداگانہ شناخت رکھنے کے باوجود سندھ کی تہذیبی و معاشرتی اکائی کا حصہ بن جاتے ہیں۔ سب سے دل چسپ صورتِ حال تو افریقی نسل کے مکرانیوں اور شیدیوں کی ہے جو لگ بھگ چار پانچ سو سال قبل جنگی سپاہیوں، غلاموں اور تجارتی محنت کشوں کی صورت میں یہاں آئے۔ وہ لوگ اپنی عادات، رنگ و نسل اور بود و باش میں مقامی لوگوں سے یکسر مختلف ہونے کے باوجود سندھ کی قوم پرست تحریکوں سے اپنا تاریخی اور قومی ہیرو ہوش محمد شیدی (ہوشو شیدی) کو ہی منتخب کیا۔ یہ وہی ہوشو شیدی تھا جس نے کراچی میں انگریزوں کے قبضے سے قبل آخری مقابلے کے وقت مشہورِ زمانہ نعرہ لگایا کہ ''مرسوں مرسوں سندھ نہ ڈے سوں'' یعنی مرتے مر جائیں گے لیکن سندھ پر قابض نہ ہونے دیں گے۔ غرض کہ وہ تمام تہذیبی و ثقافتی اور معاشرتی گروہ جو تاریخ کے مختلف ادوار میں سندھ میں وارد ہوئے، یہاں کے تہذیبی، ثقافتی اور معاشرتی منظر نامے کا حصہ بن گئے۔ اس تناظر میں مہاجروں اور سندھیوں کے ذہنوں میں ایک دوسرے کے خلاف ابلنے والی منافرت اور اندیشے کا بہ ظاہر کوئی جواز نظر نہیں آتا[80]۔

ان مہاجروں کے ذہنوں سے علاحدہ قومیت کا تصور ختم کروانے کے لیے اولاً سندھ کو یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑے گی کہ اردو بولنے والے سندھ کی سیاست کا نہ صرف دوسرا سب سے بڑا گروپ ہیں بلکہ اب سندھ ہی ان کا وطن ہے۔ اس مستقل وطنیت کی وجہ سے وہ اپنے حقوق کو خیرات کے طور پر نہیں بلکہ اپنا جائز حق سمجھ کر لینا چاہتے ہیں۔ جس طرح اس سے پیش تر سندھ میں آباد ہونے والے متعدد ریلے امتداد زمانہ کے سبب اس صوبے کے فرزند زمیں بنتے چلے گئے[81]۔ سید مظہر جمیل نے سندھو دیش اور مہاجر صوبے وغیرہ کو جذباتی اور غیر منطقی نعرہ قرار دیا ہے اور سندھ کا سب سے بڑا مسئلہ معاشی حق تلفی کو قرار دیا ہے[82]۔ سماجیات کے ماہرین متعدد مواقع پر اس بات کا برملا اظہار کر چکے ہیں کہ اگر یہ مواقع معاشی ناہمواریاں اور حق تلفی کی حد سے زیادہ بڑھ جائیں تو بعض اوقات شدید ترین جذبات کسی بڑے انقلاب یا تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ سندھ خصوصاً کراچی کے مسئلے کو معاشی مسئلہ کہہ کر اسے محدود تناظر میں دیکھنا غالباً کوتاہ نظری ہوگی بلکہ اسے وسیع تناظر میں سیاسی، سماجی اور انفرادی شناخت کے حصول کا مسئلہ سمجھ کر یہاں کے رہنے والوں کے احساسِ محرومی کو دور کرنے کی کوشش کرنا بے حد ضروری ہے۔ اس کے

ساتھ ساتھ ون یونٹ کے زمانے میں سندھ کی تجارت، صنعت اور روزگار پر جس طرح غیر سندھی قابض تھے، اور جس کی وجہ سے سندھ کے نوجوانوں میں بھی احساسِ محرومی کی جو شدید لہر پیدا ہوئی تھی، اس کا سدِ باب بھی ضروری تھا[۸۳]۔ بعد میں آنے والی حکومتوں خصوصاً ذوالفقار علی بھٹو، بے نظیر بھٹو اور سندھ کے اندر بسنے والی پیپلز پارٹی کی متعدد صوبائی حکومتوں نے اس مسئلے کو حل کرنے کی حتیٰ الامکان کوشش ضرور کی مگر ابھی اس سلسلے میں بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ دوسری جانب کراچی کی اردو بولنے والی آبادی کے معاشی اور سیاسی استحصال کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اور ان مسائل پر اربابِ اقتدار کی ابھی تک توجہ مبذول نہیں ہوئی ہے جس کی وجہ سے سندھ کی شہری آبادی میں احساسِ محرومی بڑھا۔

سندھ کے اندر احساسِ محرومی کا یہ سلسلہ کوئی نیا نہیں ہے بلکہ اگر فوج اور سویلین نوکر شاہی میں ملازمتوں کے اعداد و شمار کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہو جائے گا کہ یہ مسئلہ کس قدر پرانا ہے اور اس کے تدارک کی کیا کوششیں اب تک بروئے کار لائی گئیں۔ ۱۹۶۰ء کے عشرے میں فوج میں ۶۰ فی صد پنجابی، ۳۵ فی صد پختون اور محض ۵ فی صد دوسری قومیتوں کے لوگ شامل تھے۔ آرمی کے ۴۸ جنرلوں میں ۱۷ پنجابی، ۱۹ پختون، ۱۱ مہاجر اور صرف ایک بنگالی جنرل تھا[۸۴]۔ ذوالفقار علی بھٹو کے زمانے میں فوج سے پشتونوں اور مہاجر افسروں کی جبری سبک دوشی کے بعد فوج کے اعلیٰ ترین عہدوں سے یہ تناسب و توازن قطعی طور پر یک طرفہ ہو گیا۔

کچھ یہی صورتِ حال سول بیورو کریسی کی رہی۔ ایوب خان کی بد عنوانی کے الزام کا سہارا لے کر جن ۱۳۱۳ افسران کو ملازمت سے برخاست کیا ان میں بہت بڑی تعداد مہاجر افسروں کی تھی۔ بعد میں یحییٰ خان اور بھٹو نے بھی نوکر شاہی سے اعلیٰ افسران کی چھانٹی کے دوران اعتدال، انصاف اور غیر جانب داری کے تقاضے پورے نہیں کیے بلکہ ایک طرح کا متعصبانہ رویہ اختیار کر کے بڑی تعداد میں مہاجروں کو سرکاری ملازمتوں سے نکال دیا۔ یہی عمل بینکاری اور صنعت کے شعبوں میں بھی دہرایا گیا[۸۵]۔ نتیجتاً سندھ کے شہری علاقوں کے احساسِ محرومی میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ایک جانب سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان پر بند ہوتے چلے گئے۔ دوسری جانب شہری ترقی خصوصاً بنیادی انسانی ضروریات کے حصول میں بھی سندھ کے شہری علاقوں کے ساتھ سوتیلی ماں جیسا سلوک روا رکھا گیا۔ اس صورتِ حال نے اس دور کے شاعروں اور ادیبوں کو کافی متاثر کیا۔ روزمرہ کے ان مسائل اور سیاسی، سماجی اور معاشی معاملات پر رئیس امروہوی کے قطعات نے بھرپور انداز سے روشنی ڈالی۔ قیام پاکستان کے بعد لاکھوں کروڑوں افراد نے روزمرہ کی سیاسی، سماجی اور معاشی زندگی کے بارے میں جو کچھ سوچا اور سماجی تبدیلیوں کے جو اثرات قبول کیے، یہ سب اثرات ان قطعات کی صورت میں موجود ہیں[۸۶]۔ گویا یہ قطعات نصف صدی کی تاریخ ہیں جن میں ہر اس اہم

واقعے کو ضرور موضوع بنایا گیا ہے جس نے ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی پر کسی بھی طرح سے اثرات مرتب کیے ہوں۔ انھوں نے تقریباً ہر اہم موضوع پر قطعے لکھے اور اپنی قادر الکلامی کے جوہر دکھائے۔ برصغیر میں رونما ہونے والے اہم سیاسی واقعات کو بنیادی موضوع بنانے کے ساتھ ساتھ ارد گرد پیش آنے والے سیاسی اور سماجی معاملات پر بھی ان کی نظر گہری تھی۔ یہ قطعات قیامِ پاکستان سے قبل اور بعد کی سیاسی و سماجی صورتِ حال کا آئینہ دار ہیں[۸۷]۔ وہ ابتدا ہی سے ایک سیاسی کارکن کے طور پر ہندوستان کی سیاست میں سرگرم عمل رہے۔ خود رئیس امروہوی کا کہنا تھا کہ وہ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء تک کانگریس سے وابستہ رہے۔ انھوں نے جواہر لال نہرو کے ساتھ بھی کام کیا لیکن جلد ہی کانگریس کی سازشی سیاست کا عقدہ ان پر کھل گیا اور وہ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ میں بہ طور رضاکار شامل ہو گئے۔ صہبا لکھنوی نے سہواً رئیس امروہوی کے قطعات کے آغاز کی بابت لکھا کہ ۳۱ جنوری ۱۹۳۸ء سے قطعہ نگاری کا آغاز روزنامہ جنگ کراچی سے کیا جو تادمِ زیست جاری رہا[۸۸]۔ اس بابت یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ۱۹۳۸ء کو روزنامہ ''جنگ'' نامی کسی اخبار کا وجود نہیں تھا بلکہ اس اخبار کا آغاز ۱۹۳۹ء سے ہوا۔ صہبا لکھنوی کی یہ بات اس لیے بھی غلط ثابت ہوتی ہے ۳۱ جنوری ۱۹۳۸ء میں رئیس امروہوی کے قطعات کے آغاز کی بابت جو پہلا قطعہ انھوں نے درج کیا وہ یہ ہے:

جس نے اُمیدِ زیست باندھی تھی
لے اُڑی اس کو موت کی آندھی
گولیاں کھا کے گالیاں کھا کے
چل بسے اُف مہاتما گاندھی[۸۹]

اس قطعے کو پڑھ کر سیاسی تاریخ کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی یہ بات اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ گاندھی کے قتل کا واقعہ تقسیم ہند کے اگلے برس یعنی ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو رونما ہوا[۹۰]۔ اور یہ قطعہ اسی واقعے کی جانب اشارہ کر رہا ہے۔ رئیس امروہوی نے یہ قطعہ اس کے اگلے روز ہی ۳۱ جنوری ۱۹۴۸ء کو لکھا اور غالباً سہو کاتب سے یہاں ۱۹۳۸ء درج ہو گیا۔

رئیس امروہوی ۳۳ برس کی عمر میں کراچی آئے اور یہاں مستقل ۴۱ برس تک قطعات لکھتے رہے۔ ان برسوں میں وہ کراچی کی پہچان بن گئے۔ رونامہ جنگ کے قطعہ نگار کی حیثیت سے وہ نہ صرف پاکستان بلکہ پوری اردو دنیا میں اپنا ایک خاص مقام بنا چکے تھے۔ وہ سیاسی قطعہ نگاری کے باوا آدم تھے اور یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے

کہ اردو ادب کی تاریخ میں کوئی بھی شاعر اس میدان میں ان کا حریف نہیں ہے۔ ان کے قطعات کا انتخاب ابتداً دو جلدوں میں ''اخبار جہاں''، پبلی کیشنز کراچی نے شائع کیا جس میں ۵ جون ۱۹۴۷ء سے دسمبر ۱۹۵۸ء تک کے قطعات کا انتخاب شامل ہے۔ اس کے بعد ۱۹۸۷ء۔۱۹۸۸ء میں چار جلدوں پر مشتمل ایک اور انتخاب ۱۹۴۷ء تا ۱۹۸۶ء کے قطعات پر مشتمل پاک اورینٹل پبلی کیشنز نے شائع کیا۔ ۱۹۸۶ء تا اختتام زندگی کے قطعات کا مجموعہ ہنوز اشاعت کا منتظر ہے۔ ان قطعات میں پاکستان اور دنیا بھر میں وقوع پذیر ہونے والے اہم معاملات پر ایک فوری رد عمل سامنے آتا ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا سماجی، معاشی، سیاسی، اخلاقی، مذہبی اور عوامی مسئلہ ہو جس پر انھوں نے قلم نہ اٹھایا ہو[91]۔ اپنے قطعات کی بابت انھوں نے خود لکھا کہ :

جو ناسخِ آثارِ کہن ہے وہ کتاب ۔۔۔ بے خطرۂ تنسیخ لکھی ہے میں نے
آئینۂ امروز ہیں میرے قطعات ۔۔۔ اس عہد کی تاریخ لکھی ہے میں نے[92]

ظاہر ہے ان قطعات سے حکمرانوں کی جبینوں پر شکنیں آنا ایک فطری امر تھا۔ وہ خود بھی اس امر سے پوری طرح واقف تھے کہ ان قطعات سے بعض اوقات جبینِ خسروی پر شکنیں پڑ جاتی ہیں۔ لٰہذا اس بات کا برملا اظہار بھی ان کے یہاں موجود ہے۔ معاشرے کی طبقاتی تقسیم، تضادات، عوام کے بنیادی حقوق کا مسئلہ، محنت کشوں کی حق تلفی کا مسئلہ، حرصِ زر، پاکستان کی نظریاتی شکست وریخت، قائدِ اعظم کی تعلیمات سے انحراف، اسلام کے نام پر عوام کا استحصال، پاکستان میں بسنے والی مختلف قومیتوں اور زبانوں کے تصادم خصوصاً کراچی کے مخصوص مسائل، آبادی کی بے تحاشا توسیع، پانی کی قلت، ٹرانسپورٹ اور ٹریفک کی زبوں حالی، صنعتی زندگی کا پیدا کردہ سماجی بحران اور اس کے نفسیاتی اثرات، مشینی اور میکانکی طرزِ حیات اور اس کے نقصانات، خاندانی شیرازوں کا بکھرنا، غرض قومی منظر نامے کے ہر پہلو کا جائزہ رئیس امروہوی کے قطعات میں موجود ہے۔ نئے شہر میں نئے مہاجرین کا سب سے بڑا مسئلہ اپنی انا کو برقرار رکھتے ہوئے عزت وناموس کی حفاظت کا تھا۔ دین کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے ہجرت کے جس عذاب کو ان مہاجرین نے سہا تھا اس کی واحد وجہ عزت وناموس کی حفاظت تھی لیکن نئی مملکت میں جاگیر دارانہ اور وڈیرانہ سوچ کے نتیجے میں جب مہاجر کیمپ سے ہی ان کی بہو بیٹیوں کو غائب کیا جانے لگا تو رئیس امروہوی نے اپنے قطعے مورخہ ۵ جولائی ۱۹۴۸ میں نہایت کرب کے ساتھ لکھا کہ :

کل مہاجر کیمپ سے لڑکی کوئی گم ہوگئی ۔۔۔ دل شکستہ باپ نے حسرت سے چھاتی کوٹ لی
رو کے بولا کافروں نے گھر ہی لوٹا تھا فقط ۔۔۔ ان مسلمانوں نے گھر کی آبرو تک لوٹ لی[93]

نئے مہاجرین کی آباد کاری اس دور کا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ ابتدا ہی سے اس جانب توجہ تو دی گئی لیکن جیسا کہ رئیس امروہوی کے قطعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ :

ستم کشانِ فسادات ہند کا دھارا کہیں سے اے دلِ بے تاب رک نہیں سکتا
ہزاروں راہ میں ہیں قید و بند کے پشتے مہاجرین کا سیلاب رک نہیں سکتا[۹۴]

لہٰذا اتنی بڑی تعداد میں آنے والوں کی رہائش اور آباد کاری کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس بابت کچھ حکومتی تساہل بھی تھا اور کچھ معاشی مسائل بھی درپیش تھے۔ لیکن ہر صورت میں عام مہاجرین کی زندگی کس مپرسی کی حالت میں بسر ہو رہی تھی۔ اس صورتِ حال کا نقشہ کھینچتے ہوئے انھوں نے کہا کہ :

مردہ مہاجرین کی قبروں کے نوحہ خواں میں تجھ سے کر چکا ہوں گزارش یہ بار بار
مردے کو چھوڑ شہر کے گوشوں میں جا کے دیکھ زندہ مہاجرین کی قبریں ہزارہا[۹۵]

مہاجرین کی آمد کے بعد رہائشی مسائل اور مشکلات میں مبتلا لوگوں کی پریشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے حکام بالا کو اس سنگین مسئلے کی طرف توجہ دلائی اور ان لاکھوں مہاجرین کی نمائندگی کرتے ہوئے لکھا کہ :

تم مجھے اشک بہانے پر ملامت نہ کرو ضبط کر لوں گا ان اشکوں کو اگر ضبط ہوا
مبتلا خبط میں کیوں ہوں نہ کرے خانہ بدوش سندھ میں گھر نہ ملا، ہند میں گھر ضبط ہوا[۹۶]

وہ مہاجرین جو اپنا سب کچھ قربان کر کے اس نئی مملکت میں بسنے کے سہانے خواب دیکھ رہے تھے، بہت جلد انھیں احساس ہونے لگا کہ یہاں ان کے ساتھ غیریت کا سلوک روا رکھا جانے لگا ہے۔ ان کے مسائل کی طرف بالکل توجہ نہیں دی جا رہی ہے اور انھیں عجیب عجیب ناموں اور القابات سے نواز کر طنز و تحقیر کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ اسی لیے بہت جلد ان مہاجرین کے دلوں میں طرح طرح کے وسوسوں نے جنم لینا شروع کر دیا۔ اور انھوں نے بھی تلخ لہجہ اختیار کرتے ہوئے سوالات اٹھانے شروع کر دیے۔ ان سوالات کو شاعری کا جامہ پہنا کر رئیس امروہوی نے بھی کچھ قطعات لکھے اور ان مظلوموں کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا کہ :

ہم نے اس ارضِ پاک کی خاطر ساری دنیا کو تج دیا گویا
تم کو عشقِ وطن کے دعوے ہیں تم بتاؤ کہ تم نے کیا کھویا[۹۷]

ظاہر سی بات ہے کہ اس قربانی کے بعد ایک نئے شہر میں بس جانا کوئی آسان نہ تھا۔ لوگ بغیر تحقیق کے کراچی کے بارے میں بہت سی ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جن کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ مثلاً عام طور پر لوگوں کا

یہ مانا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد ابتدائی بیس تیس برسوں تک کراچی بہت صاف ستھرا شہر ہوا کرتا تھا۔ اس کی سڑکیں روزانہ دھلا کرتی تھیں۔ لیکن بہت تیزی سے پھیلتے ہوئے اس شہر میں قیام پاکستان کے ابتدائی زمانے سے ہی ہر طرح کے مسائل نے جنم لینا شروع کر دیا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ جن مقامات پر انگریز اور پارسی آبادیاں تھیں وہاں پر ہر طرح کی صفائی ستھرائی کا انتظام موجود تھا لیکن تیزی سے پھیلتی ہوئی نئی آبادیوں میں صورتِ حال دگرگوں تھی۔ اس منظر کو پیش کرتے ہوئے اگست ۱۹۴۹ء ہی میں رئیس امروہوی نے کہا کہ :

یہ ذکر تھا کہ شہر کے مہتر ہیں کام چور حد سے گزر چکی ہے کراچی کی گندگی
ہیں سلطنت میں آپ کے کتنے حلال خور میں نے کہا درست ہے لیکن خطا معاف[۹۸]

اس کے باوجود اس زمانے کے قطعات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ رئیس امروہوی ان حالات سے کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ جب جب کوئی نئی بستی بسائی جاتی، رئیس امروہوی اس میں بسنے والے مہاجرین کی حب الوطنی اور زندگی کی مشکلات سے نبرد آزما ہونے کی لگن کا تذکرہ ضرور قطعات کی صورت میں کرتے۔ مثلاً کراچی کے ایک علاقے نئی کراچی کی آبادکاری پر ۲۲ دسمبر ۱۹۴۸ء کے ایک قطعے میں وہ کہتے ہیں کہ :

نئی کراچی سے زندگی کا نیا فسانہ شروع ہوگا جہانِ کہنہ کو رونے والے نئی کراچی کا تذکرہ کیا
یہی وہ گلیاں ہیں جن میں پل کر نیا تمدن طلوع ہوگا[۹۹] یہی وہ کوچے ہیں جن میں ڈھل کر بنیں گے تہذیبِ نو کے سانچے

کراچی کے ساتھ یہ بے رخی کوئی نہیں بات نہیں۔ جس بات کا رونا آج ہم روتے دکھائی دیتے ہیں، یہ مسائل ابتدائی زمانے میں بھی موجود تھے۔ حکمرانوں کی عدم توجہی کے باعث ان مسائل میں روز بروز بے تحاشا اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے باوجود امید افزا نغموں کی گونج ہمیں یہ بتا رہی تھی کہ یہ شہر ایک روز ضرور اپنی عظمت کا اعتراف کروا لے گا۔ جنوری ۱۹۵۱ء ہی میں رئیس امروہوی کراچی کی بابت یہ فرما رہے تھے کہ :

تخلیق کا وہ جذبہ ٹھہرے کا نہ دم لے گا جو ساری و جاری ہے ذروں میں کراچی کے
ان ریت کے ٹیلوں سے اک شہر جنم لے گا[۱۰۰] ان ریت کے ٹیلوں کو دیکھو نہ حقارت سے

اور حقیقتاً ایسا ہی ہوا۔ نئے آنے والے مہاجرین نے مل جل کر اپنی مدد آپ کے تحت ایسے ایسے کام کیے جن کی تفصیل کا بیان یہاں ممکن نہیں۔ البتہ ان کے عزائم دیکھ کر شاعر ضرور مستقبل کی پیش بینی کر رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ :

نواحِ سندھ و کراچی کہ آج ہے ویراں — اسی زمیں پر بہشتِ بریں سجا دیں گے
اودھ کا نام نہ لے، لکھنؤ کا ذکر نہ کر — اسی دیار کو ہم لکھنؤ بنا دیں گے[۱۰۱]

ملک کے مختلف حصوں میں صوبوں اور مختلف لسانی گروہوں کے درمیان باہمی چپقلش کی داغ بیل بھی اسی زمانے میں پڑ چکی تھی بلکہ کراچی وہ واحد شہر تھا جہاں ابھی تک اس قسم کی آواز نہیں اٹھائی گئی تھی۔اس تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جنوری ۱۹۵۳ء کے ایک قطعے میں وہ کہتے ہیں کہ :

ہر صوبہ اپنے حق کے لیے ہے زباں دراز — گز بھر زبان رکھتے ہوئے بے زباں ہو تم
خود پوچھتی ہے مجلسِ دستور ساز بھی — اے قائدینِ شہرِ کراچی کہاں ہو تم[۱۰۲]

اور اس حق تلفی اور صوبائی و لسانی نعرے بازی سے متاثر ہو کر بلآخر کراچی میں بھی کچھ حقوق کی بات کی جانے لگی۔ پہلی بار ۱۹۵۴ء میں کراچی کے لیے علاحدہ صوبہ یا صوبائی حقوق کا مطالبہ پیش کیا گیا۔اس حوالے سے مخالفین کا بہت سخت ردعمل دیکھنے میں آیا۔ حکومتی مشینری اور طاقت کا استعمال کرتے ہوئے مہاجر آبادیوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔اس جانب اشارہ کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ :

کچھ شعوری جوش نے کچھ لاشعوری جوش نے — عقل کو آمادۂ جنگ و جنوں کر ہی لیا
انقلابی جوش کا آتش فشاں پھٹ ہی پڑا — اے کراچی! تونے آخر غسلِ خوں کر ہی لیا[۱۰۳]

لالوکھیت اور گولی مار کے فسادات میں ہلاکتوں اور مہاجر نوجوانوں اور بزرگوں کی ہلاکتوں پر کہا کہ :

کیسے کیسے زندہ دل ساتھی کراچی میں رئیس — کھاد بن کر رہ گئے اور کھیت ہو کر رہ گئے
جو بہارِ باغِ ملت تھے وہ اہلِ دل یہاں — نذرِ گولی مار، لالوکھیت ہو کر رہ گئے[۱۰۴]

حکومتی تساہل اور کراچی کے ساتھ بے حسی کے رویے نے بلآخر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مایوسی کی شکل اختیار کرلی۔اب لوگ حکمرانوں سے مایوس ہو کر دور دراز کی بستیوں میں اپنی مدد آپ کے تحت آبادکاری کا سوچ رہے تھے۔اس حکومتی رویے کے خلاف طنز کرتے ہوئے شاعر کا کہنا تھا کہ :

صعود و ماہ و ستارے کا سلسلہ فی الحال — بس اس قدر ہے ہماری نگاہ میں شاید
مہاجرین کی بستی بسائی جائے گی — نواحِ مہر و مضافاتِ ماہ میں شاید[۱۰۵]

ظاہر سی بات ہے کہ ایک طرف امریکا اور روس جیسے ممالک تسخیر خلا کے پروگرام پر زور وشور سے عمل پیرا تھے اور یہاں یہ مسئلہ حل ہو کر نہیں دے رہا تھا کہ ہندوستان سے آنے والے مہاجرین کو کہاں بسایا جائے۔ ان عقل مند حکمرانوں کی بے عقلی پر رئیس امروہوی طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ :

بھینس افضل ہے کہ عقل، الجھا ہوا سا اک سوال ۔۔۔ کوئی تو اس مسئلے کا حل بتانا چاہیے
جو کراچی میں بہت نازاں ہیں اپنی عقل پر ۔۔۔ بھینس کالونی میں ان سب کو بسانا چاہیے[۱۰۶]

پچاس کی دہائی میں آبادی کے بڑھتے ہوئے دباؤ اور ناقص شہری منصوبہ بندی کے نتیجے میں اس شہر کی فضا بہت آلودہ ہو گئی تھی۔ اسی سبب دارالحکومت کی منتقلی کا فیصلہ بھی سامنے آیا۔ یہ فیصلہ کراچی والوں کو اپنے اوپر ایک اور ظلم دکھائی دیا۔ ظاہر سی بات ہے کہ جب یہ شہر وفاق کی سرپرستی میں گندگی اور غلاظت کا ڈھیر بنتا جا رہا تھا۔ بقول شاعر :

وبا اور غلاظت کا احوال سن کر ۔۔۔ یہ بولیں مسماۃ اللہ رکھی
کہ دونوں غریبوں کے پیچھے پڑے ہیں ۔۔۔ علاقے کا مکھیا، محلّے کی مکھی[۱۰۷]

حکام بجائے اس کے کہ اس بڑے شہر کے مسائل کو حل کرنے کی جانب توجہ مبذول کرتے، حل یہ نکالا کہ کراچی کی آب و ہوا کو مضرِ صحت قرار دے کر دارالحکومت کی تبدیلی کو ناگزیر قرار دے ڈالا۔ مارشل لا حکام کے اس فیصلے پر طنز کرتے ہوئے شاعر کا کہنا تھا کہ :

شہر کی مکّھیاں خدا کی پناہ ۔۔۔ کیا ندیدی ہیں کیا بھنکتی ہیں
یہ جسارت تو دیکھیے ان کی ۔۔۔ ذہنِ حکام پہ بھنکتی ہیں[۱۰۸]

آلودگی اور گندگی کی صورتِ حال اس قدر دگرگوں تھی کہ رئیس امروہوی اس شہر کی حالت پر کفِ افسوس ملتے ہوئے یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ :

حالتِ آب و ہوا یہ کہ ہوا گرد آلود ۔۔۔ اب رہا آب تو کیچڑ کا دو آبہ نکلا
ہم کراچی کو سمجھتے تھے بہشتِ مشرق ۔۔۔ اب جو اس عہد میں دیکھا تو خرابہ نکلا[۱۰۹]

ایک عام تاثر یہ ہے کہ کراچی میں رہنے والے تمام افراد معاشی طور پر بہت آسودہ حال ہیں۔ حالاں کہ یہ خیال مجموعی صورتِ حال کی درست عکاسی نہیں۔ اس شہر کے پھیلاؤ، اس کی آبادی کا دباؤ اور گوں ناگوں مسائل کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ زبان ولسان سے قطع نظر ہر طبقۂ فکر کے لوگوں میں بے تحاشا غربت پائی جاتی ہے۔ محض چند آسودہ حال بستیوں کی خوش حالی دیکھ کر بد حال لوگوں کے معاشی مسائل سے نظریں چرانا عقل مندی کی دلیل

نہیں۔ ہاں کچھ ایسے ضرور تھے جو اس زمانے میں بھی مکر و فریب اور دھوکے سے اپنی دولت میں بے دریغ اضافہ کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ ایسی صورتِ حال کا نقشہ کھینچتے ہوئے شاعر نے کہا کہ :

زندگی بے جلوہ و بے رنگ و بے جوہر کہاں　　خود فروزی، خود نمائی، خود تراشی چاہیے
سادہ لوحوں کا مقدر فقر و فاقہ کیوں نہ ہوا　　خوش معاشی کے لیے بھی بد معاشی چاہیے"[۱۰]

خراب معاشی صورتِ حال پر یہ بھی کہا کہ :

رزق و معاش تنگ تو ماحول دل خراش　　ہم لوگ اس فضا میں بہ صد بے دلی جیے
سچ مچ ہوائے شہرِ کراچی ہے دوست کش　　قائد یہاں جیے نہ لیاقت علی جیے"[۱۱]

آبادی کے دباؤ اور ناقص منصوبہ بندی کے نتیجے میں کراچی میں ٹریفک کے مسائل بھی کئی دہائیوں سے جوں کے توں موجود ہیں۔ ۱۹۶۰ء کے ایک قطعے میں بسوں میں گنجائش سے زیادہ مسافروں کی حالت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ :

لو ہم سفر کو ہم سفروں سے گریز ہے　　لو ہم نفس کو ہم نفسوں میں جگہ نہیں
یہ عذر بھی عجیب ہے یارانِ راہ کا　　دل میں جگہ ہے اور بسوں میں جگہ نہیں"[۱۲]

انتظامیہ کی بے حسی اور ٹریفک اہل کاروں کی لاپرواہی کا رونا بھی کراچی کے لیے کوئی نئی بات نہیں۔ اسی سبب ۶۰ کی دہائی میں بھی بعض قطعات اس اہم مسئلے کی جانب اشارہ کرتے دکھائی دیتے ہیں، جیسے :

کیا ہیں یہ حادثے ٹریفک کے　　خونِ انساں کی رنگ رلیاں ہیں
یہ کراچی کی خوں چکاں سڑکیں　　شاہراہِ عدم کی گلیاں ہیں
ملک الموت سے ٹکرا کے رئیس　　دیکھتا ہے کہ کہاں گرتے ہیں
ہم کہ اس شہر کے بازاروں میں　　سر ہتھیلی پہ لیے پھرتے ہیں"[۱۳]

حکومت کی بے حسی کا یہ عالم تھا کہ حادثے کا شکار ہونے والوں کے لیے محض دس ہزار روپے کا معاوضہ مقرر کر کے اپنی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو جاتے تھے۔ اس صورتِ حال کی بابت رئیس امروہوی نے لکھا کہ :

سرِ بازار ایک ٹکر میں　　ختم آلام زندگی کرلو
ہے ہر اک بس ڈرائیور کی صدا　　چند آنے میں خود کشی کرلو"[۱۴]

ٹریفک کے مسائل نے رفتہ رفتہ سنگین صورت اختیار کرلی گئی۔ پولیس اور انتظامیہ کی بے حسی نے اس صورتِ حال کو مزید بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ سڑکوں پر ہونے والے حادثات میں بتدریج اضافے پر اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ :

کوئی اندازہ کر سکتا ہے کیا رفتار ہستی کا   کہ یہ گاڑی بقدرِ ہمتِ ہر کس نہیں چلتی
یہ سڑکیں آہ یہ سڑکیں کہ ان خوں خوار سڑکوں   کسی کا بس نہیں چلتا کسی کی بس نہیں چلتی[۱۵]''

پر

ایک اور قطعے میں کچھ اس قسم کی صورتِ حال پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

سوار و سواری برابر ہوئے   ترقی کی لے اس قدر بڑھ گئی
کہ بس پر مسافر کے چڑھنے سے قبل   سنا ہے مسافر پہ بس چڑھ گئی[۱۶]''

ٹریفک کے علاوہ کراچی میں پانی اور بجلی کے مسائل نے بھی ایک طویل عرصے سے لوگوں کو پریشان کر رکھا ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد سے اب تک کسی بھی حکومت نے عوام کے اس دیرینہ مسئلے کی جانب خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ جون ۱۹۸۱ء کے ایک قطعے میں رئیس امروہوی اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ :

اس شہر میں پانی کی بجلی کی مصیبت ہے   اب کس سے کہیں جا کر اُٹھ رفعِ مصیبت کر
اے ابرِ کرم! تو ہی یاروں کا سہارا ہے   بجلی بھی عنایت کر پانی بھی عنایت کر[۱۷]''

خصوصاً پانی جیسی اہم بنیادی ضرورت کو جس طرح اس شہر کی مقامی اور صوبائی حکومتوں نے نظرانداز کیا اس نے شہر میں کئی بار امن وامان کی صورتِ حال کو بھی تشویش ناک صورتِ حال تک پہنچایا۔ یہ صورتِ حال بھی کراچی کے لیے کوئی نئی نہیں تھی، بلکہ پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں بھی ان مسائل نے پوری طرح شہر کو جکڑ رکھا تھا۔ ۱۹۶۱ء کے اس قطعے کو دیکھیے :

دستِ تقدیر کی ہم تشنہ لبوں کی خاطر   بس یہی زہر کا ساغر ہے پیو یا نہ پیو
زم زم و کوثر و تسنیم و لبن کے پیاسو   آبِ گندہ ہی میسر ہے پیو یا نہ پیو[۱۸]''

ظاہر سی بات ہے کہ ۱۹۵۱ء میں کراچی کی جو آبادی محض ۱.۰۶ ملین نفوس پر مشتمل تھی، جو محض ۴ برسوں میں بڑھ کر ۲ ملین تک جا پہنچی۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ حکمران اس سنگین مسئلے کی طرف سنجیدگی سے توجہ دیتے

لیکن فوری طور پر اس جانب کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ اس کا اندازہ مزید چار برس گزرنے کے بعد رئیس امروہوی کے ۱۹۶۵ء کے اس قطعے سے لگایا جا سکتا ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ :

زندگی سے سیر جینے کی طلب موجود ہے — آبِ شیریں کم گروہِ تشنہ لب موجود ہے
اے کراچی! حیف پینے کے لیے پانی نہیں — ڈوب مرنے کے لیے بحرِ عرب موجود ہے[19]

بعد میں اس مسئلے کے حل کے لیے کچھ اہم اقدامات ضرور اٹھائے گئے اور گریٹر کراچی پبلک واٹر سپلائی اسکیم کو چار مرحلوں میں مکمل کرنے کا منصوبہ بھی بنایا گیا۔ اس کا پہلا فیز ۱۹۶۷ء میں مکمل ہوا جس سے کراچی کو ۷۰MGD پانی ملنے لگا[20]۔ لیکن ۱۹۶۷ء میں رئیس امروہوی کے ان قطعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ اس وقت بھی پوری طرح حل نہ ہو سکا۔ ملاحظہ کیجیے :

انتظامِ آب کی تنظیم بھی کافی نہیں — اہتمامِ آب کی تقسیم بھی کافی نہیں
اے کراچی! تیری رفعِ تشنگی کے واسطے — سلسبیلِ کوثر و تسنیم بھی کافی نہیں

چلنے لگا ہے الٹا قدرت کا کارخانہ — کیا چاہتی ہے آخر اے گردشِ زمانہ
پانی کو کیوں نہ ترسیں دانے کو کیوں نہ پھڑکیں — بندوں کے ہاتھ میں ہے تقسیمِ آب و دانہ[21]

حکومتی اداروں کا یہ کہنا تھا کہ جون ۱۹۷۰ء تک کراچی میں پانی کا مسئلہ نہیں رہے گا۔ اس بابت جو اقدامات کیے جا رہے تھے وہ وقتاً فوقتاً پایۂ تکمیل تک بھی پہنچ رہے تھے مثلاً ۱۹۷۲ء میں دوسرے فیز کے طور پر مزید ستر MGD پانی کی سپلائی، پھر ۱۹۷۷ء میں ستر MGD کا مزید اضافہ اور چوتھے فیز یعنی ۱۹۸۵ء میں پچاس MGD بیپری تک مہیا کیا جانا تھا[22]، لیکن جب تک یہ منصوبے پایۂ تکمیل تک پہنچتے اس شہر کی آبادی میں مزید کئی گنا اضافہ ہو چکا ہوتا۔ اس لیے یہ مسائل ہر زمانے میں جوں کے توں رہے اور اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رئیس امروہوی نے بھی کہا کہ :

آبشارِ زندگانی بند ہے — آبِ رحمت کی روانی بند ہے
با ہمہ تشنہ دہانی بند ہے — شہر والو! آج پانی بند ہے

ہمیشہ با وضو رہتے ہیں جو لوگ — وہ یوں پانی کو ترسائے گئے ہیں
کہ بے چارے بہ عذرِ قلتِ آب — تیمم کر کے دفنائے گئے ہیں

کمی اس شہر میں ہر گز نہیں آبی وسائل کی   کنویں، جھیلیں، ندی، دریا، سمندر، نہر، نل، نالے
مگر بایں ہمہ یہ تین دن سے حال ہے اپنا   وفورِ تشنگی سے ہونٹ پیلے اور منھ کالے[۱۲۳]

حقیقت تو یہ ہے کہ ستر سال گزرنے کے باوجود آج تک کراچی کا یہ مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ ۸۰ کی دہائی میں لکھے گئے قطعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ کراچی کے شہری مسائل میں کمی کے بجائے روز بروز اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ پانی کی شدید قلت کا بیان تو ہر دور میں موجود تھا ہی۔ جیسا کہ ۱۹۸۳ء میں بھی انھوں نے کہا کہ :

قطرہ قطرہ کر کے پانی مل رہا ہے آج کل   آپ کو دینا پڑے گا قطرے قطرے کا حساب[۱۲۴]

بجلی کے مسائل نے بھی ساتھ ساتھ اسی دور میں خوب سر اٹھایا۔ دور دراز تک آبادی کے پھیلنے کے نتیجے میں بنیادی سہولیات کی فراہمی کے لیے جتنے سرمائے کی ضرورت تھی، اس قدر وسائل صوبائی اور وفاقی حکومتیں فراہم نہیں کر پا رہی تھیں۔ اسی لیے اس جانب توجہ دلاتے ہوئے رئیس امروہوی کا کہنا تھا کہ :

شہری سہولتوں کے نہ ہونے سے آج کل   آگے جو بڑھ رہے تھے وہ پیچھے کو ہٹ گئے
پانی پہ احتجاج کیا، نل کھنچ گیا   بجلی پہ اعتراض کیا تار کٹ گئے[۱۲۵]

غلاظت اور گندگی کی صورتِ حال بھی اس شہر کو ورثے میں ملی۔ دل چسپ بات یہ کہ گندے پانی کی نکاسی کا جو بندوبست مقامی اور صوبائی حکومتوں کو کرنا چاہیے تھا، اس جانب بڑے عرصے تک توجہ نہ دی جا سکی۔ افسوس ناک حد تک اس حقیقت سے کیسے نظریں چرائیں کہ KWSB نامی ادارہ جو گندے پانی کی نکاسی کا انتظام کرنے کے لیے بنایا گیا تھا، اس کا قیام ہی ۱۹۸۳ء میں عمل میں آیا[۱۲۶]۔ گویا اس سے قبل ۱۹۶۰ء میں گریٹر کراچی سیوریج ڈسپوزل اسکیم پر کام شروع ہو چکا تھا، لیکن ناقص منصوبہ بندی کے نتیجے میں شہر میں گندے پانی کی نکاسی اور ٹریٹمنٹ کرنے کا نظام بہت پیچھے رہ گیا۔ اس صورتِ حال کی وجہ سے یہ شہر ہمیشہ سے غلاظت اور گندگی کا ڈھیر رہا ہے۔ کبھی یہاں ہیضے کی وجہ سے ہلاکتیں ہوئیں تو کبھی گندا پانی پیچش کی بیماری کا باعث ہوا جس نے بچوں کی ہلاکتوں کو بڑھا دیا۔ اس صورتِ حال پر ۱۹۶۰ء میں لکھے گئے قطعات سے بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے :

کہیں بارش کا موسم گاہے گاہے بوندا باندی تک   کہیں ابرِ کرم سے پے بہ پے بارش برستی ہے
کراچی میں بھی برساتیں ہیں لیکن فرق اتنا   کہیں ہیضہ برستا ہے کہیں پیچش برستی ہے[۱۲۷]

کراچی کی دگرگوں حالت کے باوجود صنعتی ترقی کی رفتار خاصی تیز رہی۔ وفاق کو سب سے زیادہ ریونیو دینے والے اس شہر کو بجٹ کی مالیاتی تقسیم کے موقع پر ہمیشہ نظر انداز کیا جاتا تھا۔ کراچی کے مقابلے میں پنڈی اور اسلام آباد جیسے چھوٹے شہروں کے لیے زیادہ رقم مختص کی جاتی۔ ۱۹۶۶ء میں اس صورتِ حال پر رئیس امروہوی نے وفاق کی اس غیر منصفانہ پالیسی پر سخت برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ :

لاہور بھی محروم نہیں فیض سے لیکن پنڈی میں ہے بارانِ کرم سب سے زیادہ
برسوں سے یہ احبابِ کراچی کو گلہ ہے اس شہر میں برسات ہے کم سب سے زیادہ[۱۲۸]

شہر سے بے رخی اور بے اعتنائی کا جو رویہ اس عہد میں اہلِ اقتدار کی جانب سے روا رکھا گیا اس نے اس شہر کے انتظامی معاملات میں بہت زیادہ بگاڑ پیدا کیا۔ لاقانونیت، چور بازاری، ملاوٹ اور ذخیرہ اندازی کے مسائل بھی اسی زمانے سے پیدا ہونا شروع ہو گئے۔ اس جانب اشارہ کرتے ہوئے شاعر نے کہا کہ :

کہو کہ شہر میں خالص غذا نہیں ملتی کہو کہ لاگ کا موقع نہ یہ لگاوٹ کا
جو ذائقے ہیں ملاوٹ کو روکنے کے لیے کہیں خود ان میں نہ ہو شائبہ ملاوٹ کا[۱۲۹]

لوگ اس ملاوٹ والی غذاؤں سے اس قدر خوف زدہ تھے کہ شاعر کو یہ کہنا پڑا:

اف یہ آمیزشِ اشیائے غذائی کی وبا یارب اس طرح تو بندوں پہ ترے قہر نہ ہو
چائے چکھتے ہوئے خطرہ کہ نہ ہو شربتِ مرگ دودھ پیتے ہوئے دہشت کہ کہیں زہر نہ ہو[۱۳۰]

سماجی اور سیاسی زندگی کے وہ کون سے پہلو ہیں جو رئیس امروہوی کی نظروں سے پوشیدہ رہے ہوں۔ ۶۰ء کی دہائی میں انتخابی نتائج کے اعلان کے بعد کراچی میں خاصے خون ریز فسادات ہوئے، اس منظر کو پیش کرتے ہوئے بھی انھوں نے کہا کہ :

اللہ اللہ یہ نتائج انتخابِ صدر کے وقت اک خونیں فسانہ کہہ رہا ہے آج کل
شہریوں کے دو گروہوں میں یہ پیکار و فساد انتخابی خونِ فاسد بہہ رہا ہے آج کل[۱۳۱]

کراچی کی نواحی بستیوں میں جس طرح غنڈوں کی ٹولیوں نے لوٹ مار کا بازار گرم کیا، یہ بھی اس عہد کا المیہ ہے۔ اس جانب اشارہ کرتے ہوئے اپنے ایک قطعے میں لکھتے ہیں کہ :

مضطرب رہرو، شکستہ راستے، اجڑے مکان کارپوریشن نے اپنے شہریوں کو کیا دیا
لوٹنے والوں نے لوٹی تھیں نواحی بستیاں کھودنے والوں نے سارے شہر کو کھدوا دیا[۱۳۲]

صوبہ پرستی، فرقہ واریت اور لسانی گروہ بندیوں نے ملک کو جس قدر نقصان پہنچایا، شاید دشمن کے جارحانہ حملوں سے اس قدر نقصان نہ پہنچا۔ عام خیال یہ ہے کہ اس وبا نے ۸۰ء کی دہائی میں پوری طرح سے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا مگر درست صورتِ حال تو یہ تھی کہ ابتدا ہی سے جیسا کہ بنگلا زبان کے قومی زبان بنائے جانے کی تحریک کے باعث فسادات اور ہنگامے ہوں یا ملتی باہنی کی شکل میں ملک کو ٹکڑے کرنے کی سازش، ہر دور میں اس طرح کے خطرات سے یہ نوزائیدہ ملک نبرد آزما رہا ہے۔ اکتوبر ۱۹۶۹ء میں اس صورتِ حال پر رئیس امروہوی نے لکھا کہ:

ہمیں فکرِ اصلاحِ حالات کیا کہ ہم کیا؟ ہماری روایات کیا
مہاجر بے چارے پہ آفات کیوں مہاجر بے چارے کی اوقات کیا[۳۳]

جو لوگ ہجرت کر کے کراچی میں بس گئے تھے، ان کے لیے اب یہ شہر ہی حاصل متاع تھا، لیکن مقامی سطح پر انھیں جس طرح نظر انداز کیا جا رہا تھا، ملازمت اور معاشی سطح پر انھیں دیوار سے لگانے کی جو سازشیں ہو رہی تھیں، وہ اب بھی تاریخ کے ایک کڑوے سچ کی صورت میں معاشرے پر اپنے گہرے اثرات مرتب کر رہی ہیں۔ اس شہر سے اپنے تعلق اور جذباتی وابستگی کا اظہار کرتے ہوئے رئیس امروہوی کا کہنا تھا کہ:

ہم نے پایا ہے کراچی کو سبھی کچھ کھو کر نخل قربانی و ایثار کا پھل ہے یہ شہر
ہم غریبوں کے لیے ہجر نصیبوں کے لیے ہند کے پانچ سو شہروں کا بدل ہے یہ شہر[۳۴]

اپنی ہی سرزمین پر حقارت بھرے رویے کو دیکھ کر رئیس امروہوی یہ کہنے سے نہ رک سکے کہ:

مہاجرین جو ہندوستاں سے آئے ہیں خود اپنے ساتھ ہی اپنی بہار لائے ہیں
ہمیں نہ دیکھ حقارت سے اے عروسِ چمن ہمیں نے خونِ جگر سے یہ گل کھلائے ہیں[۳۶]

کوٹا سسٹم کے نام پر جس طرح مہاجر نوجوانوں کا استحصال ہو رہا تھا، اس پر مہاجر بزرگوں کو خاصی تشویش تھی۔ اپنی اس تشویش کا اظہار بھی وقتاً فوقتاً کیا جاتا رہا۔ اس سسٹم نے جس طرح میرٹ کا قتل عام کیا اس پر رئیس امروہوی نے ردعمل دکھاتے ہوئے ۲۱ جولائی ۱۹۷۱ء میں لکھا کہ:

عدل و انصاف پہ مبنی ہو تو ہے قابلِ قدر بڑا سسٹم ہو مری جان کہ چھوٹا سسٹم
ظلم ہے اہلِ کراچی پہ کھری بات یہ ہے کوٹا سسٹم کہ حقیقت میں ہے کھوٹا سسٹم[۳۶]

اس کے بعد ۱۸ اگست ۱۹۷۱ء کو بھی اپنے ایک قطعے میں اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ:

صنعت میں روزگار میں جہدِ معاش میں کوٹا ہو فرضِ عین تو کیا حق ملے ہمیں
نا مستحق ہیں اہلِ کراچی یہ طے ہوا دو فی صدی حقوق بھی ناحق ملے ہمیں[۱۳۷]

اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنے پر ناحق جو ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے۔ اندرونِ سندھ مہاجر اقلیت کے قتلِ عام کا سلسلہ جاری ہوا۔ انھیں زیادہ نمبر حاصل کرنے کے باوجود طب اور انجینئرنگ کالج میں میں داخلوں سے محروم رکھا جاتا۔ ملازمت کے دروازے ان کے لیے بند کیے جانے لگے۔ سرکاری سطح پر ان کا استحصال شروع ہوا تو رئیس امروہوی یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

اخوت کی، صداقت کی، وفا کی شرافت کی، حمیت کی، حیا کی
شعور و انقلاب و ارتقا کی مہاجر نے بڑی قیمت ادا کی[۱۳۸]

پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہونے کے بعد سندھ کی سیاسی فضا کافی مکدر تھی۔ سندھ میں تعصب کی جو آگ بھڑکی تھی، اس نے محب وطن پاکستانیوں کو تشویش میں مبتلا کر رکھا تھا۔ ابھی سقوطِ ڈھاکا کا غم تازہ تھا اور سندھ کے حالات بھی دگرگوں ہوتے جارہے تھے۔ ان حالات میں رئیس امروہوی نے تنبیہ کرتے ہوئے کہا کہ:

اے اہلِ نظر! حشر کے آثار ہیں ہر سو دیکھو نہ قیامت کہیں اس گھر سے گزر جائے
طوفانِ تعصب ابھی پہنچا ہے کمر تک ڈرتا ہوں کہ پانی نہ کہیں سر سے گزر جائے[۱۳۹]

موجودہ سندھ ایک کثیر لسانی اور کثیر القومی صوبہ ہے۔ صوبے کی اسی کثیر لسانی(Multilingual) حیثیت نے اسے ابتدا ہی سے قوم پرستی کی کش مکش کا مرکز بنائے رکھا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ سندھی قوم خود بھی برابری کے حقوق کا نعرہ لگاتی رہی ہے۔ جی۔ ایم۔ سید کے پیرو کار ۱۹۷۳ء کے آئین کو ماننے کے بجائے آزادی کی بات کرتے نظر آتے ہیں اور ''سندھو دیش'' کو اپنی منزل قرار دیتے رہے ہیں[۱۴۰]۔ اس صورتِ حال پر رئیس امروہوی نے واضح طور پر ان گمراہ لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

کس چیز کے ترجماں ہیں آخر نفرت کے بیان پے بہ پے یہ
اربابِ فساد یاد رکھیں بنگال نہیں ہے سندھ ہے یہ[۱۴۱]

حالاں کہ بھٹو بھی اس بات کا اچھی طرح ادراک رکھتے تھے کہ ان سیاسی مسائل کی اساس یہ ہے کہ موجودہ نظام کو ناگہانی انقلاب اور ہلاکت آفریں خانہ جنگی کی راہ اختیار کیے بغیر کیوں کر منسوخ کیا جائے۔ اس بابت انھوں نے خود اپنی ایک تحریر میں واضح موقف اختیار کرتے ہوئے کہا کہ اگر اقتصادی اور سماجی انصاف کے سوال کو نظر انداز کیا گیا تو

ملک کی سالمیت نہ صرف خطرے میں پڑ جائے گی بلکہ اس کا پارہ پارہ ہونا یقینی ہو جائے گا"[۱۴۲]۔ مگر ادراک کے باوجود خود بھٹو سماجی انصاف اور معاشی برابری کے اصولوں کو ملک میں رائج نہ کر سکے بلکہ سندھ کی ایک لسانی اکثریت کے دباؤ میں آکر بعض ایسے فیصلے میں بھی کیے جو دوسری لسانی اقلیت کو ہرگز قبول نہ تھے۔ حالاں کہ یہ بات پوری طرح واضح تھی کہ سندھ کی دوسری بڑی لسانی اکثریت یعنی مہاجرین نے اب صوبۂ سندھ ہی کو اپنا سب کچھ سمجھ لیا تھا۔ رئیس امروہوی نے اپریل ۱۹۷۲ء کے ایک قطعے میں واضح موقف اختیار کرتے ہوئے کہا کہ :

گہوارۂ جاں، ملت و مذہب کے لیے سندھ منزل گہہ دل، مقصد و مطلب کے لیے سندھ
اربابِ تعصب کی جہالت پہ نہ جاؤ ہم سندھ کے ہیں اور ہے ہم سب کے لیے سندھ[۱۴۳]

۱۹۷۲ء کے لسانی بل کا معاملہ ہو یا جیے سندھ کے پُر تشدد عناصر کا ہاتھ میں کلہاڑا لے کر جلوس نکالنے کا معاملہ ہو، سماجی اور سیاسی زندگی کے ہر پہلو پر رئیس امروہوی کے قطعات اس دور کا عکس ہیں۔ جیسے :

لوگ کہتے ہیں کہ لطفِ خاص ہے اس قہر میں شہد کی تاثیر ہے، قومیّتوں کے زہر میں
رفتہ رفتہ یہ حقیقت ہم پہ واضح ہوگئی دوسرے درجے کے شہری ہیں ہم اپنے شہر میں[۱۴۴]

قتل وغارت گری، خوف ودہشت اور پُر تشدد ماحول میں کبھی رئیس امروہوی یہ کہتے دکھائی دیتے ہیں کہ :

یہ پوچھے تو کوئی کشتِ وطن کے باغ بانوں سے ہم اس صحرا میں آخر کیا کریں گے جھاڑیاں لے کر
ہمیں گل دستۂ اخلاص کی جن سے تمنا تھی تماشا ہے وہ نکلے ہاتھ میں کلہاڑیاں لے کر[۱۴۵]

ناانصافی پر مبنی لسانی بل کے بعد کراچی کے حالات خاصے کشیدہ رہے۔ قتل، اغوا، فائرنگ اور آئے دن کی ہڑتالوں نے لوگوں کی زندگی اجیرن بنا دی۔ اسی صورتِ حال کا نقشہ کھینچتے ہوئے اس زمانے کے چند قطعات دیکھیے :

حیات آوارۂ صحرائے وحشت کوبکو ہوگی بقا تیغِ فنا کی آب سے بے آبرو ہوگی
شہیدوں کے چمن کو احتیاجِ رنگ و بو ہوگی نجانے یہ زمیں کس کس کے خوں سے سرخ رو ہوگی

ہم تو اخلاص و محبت سے نہ باز آئیں گے اُس طرف جہل و تعصب کے مظاہر ہی سہی
ہم تو اپنے کو سمجھتے ہیں مقامی لیکن وہ سمجھتے ہیں مہاجر تو مہاجر ہی سہی

روز مرہ کی روش ہے وادیِ مہران میں تالا بندی، فائرنگ، اغوا، لسانی حادثات
سندھ کوئی مختلف صوبہ ہے پاکستان میں دیکھ کر مرکز کی خاموشی یہ اٹھتا ہے سوال[۱۴۶]

ظاہر سی بات ہے کہ اس زمانے میں مسلسل نسلی اور لسانی حادثات ہو رہے تھے اور وفاق اس جانب کوئی توجہ نہیں دے رہا تھا۔ اسلام اور پاکستان کے خلاف جو ہرزہ سرائی جی۔ ایم۔ سید کی جانب سے ہو رہی تھی، وہ تو اپنی جگہ دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی دل آزاری کا باعث بن رہی تھی۔ اس کے علاوہ سید صاحب کھل کر لسانی منافرت کو ہوا دے رہے تھے۔ غیر سندھیوں کو یہ دھمکی دی جارہی تھی کہ انھوں نے جی۔ ایم۔ سید کے نظریات سے اختلاف کیا تو ان کی حالت بہاریوں جیسی کر دی جائے گی[۱۴۷]۔ لسانی بل کے خلاف مظاہرے کرنے والوں کو بھی جیے سندھ کی جانب سے یہ دھمکی مل رہی تھی کہ اس حمایت پر ان کی زبان کاٹ دی جائے گی:

صید اتنے ہوں تو پھر طاقت ہی کیا صیاد کی اتنے بسمل ہوں تو پھر ہیبت ہی کیا جلاّد کی
کون کاٹے گا زباں آدھے کروڑ افراد کی دیکھنا یہ ہے کہ اردو بولنے پر سندھ میں[۱۴۸]

رئیس امروہوی نے قراردادِ پاکستان سے انحراف کرنے والوں کے خلاف کھل کر لکھا کہ:

گو کہ اس بکواس کی پروا ہمیں مطلق نہیں آپ نے بکواس سُن لی دشمنانِ سندھ کی
ان کو پاکستان میں رہنے کا کوئی حق نہیں آج بھی منکر ہیں جو تحریکِ پاکستان سے[۱۴۹]

۷ جولائی کو سندھ اسمبلی نے وہ متعصبانہ لسانی بل پاس کیا جس کے تحت صوبۂ سندھ کی واحد سرکاری زبان سندھی کو قرار دیا گیا تھا۔ اس پر جو کچھ اشتعال انگیزیاں ہوئیں اور جس قسم کے فسادات ہوئے اسے دیکھ کر تھوڑی دیر کے لیے یہ محسوس ہوتا تھا کہ چند روز تک اس صوبے میں حکومت نام کی کوئی چیز ہی نہیں تھی۔ ان لسانی ہنگاموں کا مرکز کراچی تھا۔ اس تنازعے میں کافی جانی و مالی نقصان ہوا۔ ان شہیدوں کی یاد میں لیاقت آباد میں مسجدِ شہدا قائم کی گئی۔ ان حالات کی منظر کشی کرتے ہوئے رئیس امروہوی نے کہا کہ:

بنا دیا ہے کراچی تجھے دلہن ہم نے پہن کے خونِ شہیداں کا پیرہن ہم نے
سروں پہ باندھ رکھے ہیں اِدھر کفن ہم نے اُدھر ہے جسم پہ تیرے لباسِ خوں آلود

اے کراچی! تیرے مقتل تیرے مشہد کو سلام سرخ رو تو ہو گی خونِ شہیداں کے طفیل
اہلِ پنجاب و بلوچستان و سرحد کو سلام ابتدائی کامیابی ہوگئی تجھ کو نصیب[۱۵۰]

اس موقعے پر رئیس امروہوی کی ایک نظم جو سندھ اسمبلی میں پیش کیے گئے اس بل کے تناظر میں نہیں لکھی گئی تھی، کو اخبارات نے پھر سے شائع کر کے اردو کی حمایت میں مظاہرے اور تحریک شروع کی۔ کلیات رئیس امروہوی میں وہ نظم اردو کا جنازہ کے عنوان سے شامل ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

اردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

کیوں جانِ حزیں خطرۂ موہوم سے نکلے؟ کیوں نالۂ حسرت دلِ مغموم سے نکلے
آنسو نہ کسی دیدۂ مظلوم سے نکلے کہہ دو کہ نہ شکوہ لبِ مغموم سے نکلے

اردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

اس لاش کو چپکے سے کوئی دفن نہ کر دے پہلے کوئی سر سیدِ اعظم کو خبر دے
وہ مردِ خدا ہم میں نئی روح تو بھر دے وہ روح کہ موجود نہ معدوم سے نکلے

اردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے[۱۵۱]

نسلی اور علاقائی عصبیت نے دراصل اس زمانے میں اضطراب کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ سندھ کی لسانی اقلیت یعنی مہاجروں کو پناہ گیر کہہ کر تیسرے درجے کا شہری بننے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ ان حالات کی ترجمانی اس عہد کے متعدد قطعات میں کی گئی ہے۔ جیسے جولائی ۱۹۷۲ء کے یہ قطعات دیکھیے:

اگرچہ بسمل و مجروح و دل فگار ہیں ہم! خدا گواہ کہ اس قوم کا وقار ہیں ہم!
عروسِ قوم و وطن کو پناہ دی ہم نے پناہ گیر نہیں ہیں پناہ گار ہیں ہم

سندھ میں آدھے کروڑ افراد سے ایسا سلوک؟ آپ کے فہم و رسا میں کوئی گڑبڑ تو نہیں
آپ ہم کو بے محابا ہانکتے ہیں کس لیے سندھ کے صحرا میں ہم بھیڑوں کا ریوڑ تو نہیں[۱۵۲]

رئیس امروہوی سندھ کی سیاسی فضا میں موجود بے چینی اور اضطراب کی بنیادی وجہ صوبائی عصبیت اور لسانی اختلاف کو قرار دیتے ہیں۔ قبیلہ پرستی اور صوبائیت کے نعرے جو پوری دنیا سے متروک ہو کر ملت کے تصور میں ضم ہو رہے تھے، اس نئی مملکت میں اسے جو فروغ حاصل ہوا، وہ اس پر متفکر بھی تھے اور اسے قوم و ملت کے لیے زہرِ قاتل بھی سمجھتے تھے۔ ملک کی سیاسی فضا بالعموم اور سندھ کی سیاسی فضا بالخصوص جس قسم کی فرقہ بندی، گروہ بندی اور

لسانی عصبیت میں مبتلا تھی، وہ کسی سانحے سے کم نہیں تھی۔ یہ صورتِ حال چھوٹے بڑے بہت سے سانحات کا پیش خیمہ ثابت ہوئی تھی۔ اس صورتِ حال پر نہایت کرب میں مبتلا ہو کر شاعر کہتے ہیں کہ :

وہی تعصب کی مستیاں ہیں وہی تخیل کی پستیاں ہیں　　وہی قبیلہ پرستیاں ہیں حجل ہیں جن سے قبائلی تک
تم اپنی ملت کو قوم کہتے ہو اس کا احساس کیوں نہیں ہے　　تمھاری ملت گزر رہی ہے قبائلی دور سے ابھی تک

آج بھی ارضِ پاک کو درپیش　　قبل تاریخ کے مسائل ہیں
آپ کس قومیت پہ ہیں نازاں　　قوم کیسی یہاں قبائل ہیں[۱۵۳]

یہ تعصب اور نفرت مجموعی طور پر پورے ملک میں موجود تھی۔ اس زمانے میں مشرقی پاکستان، سندھ اور بلوچستان سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ جی۔ ایم۔ سید نے فروری ۱۹۷۴ء میں سندھو دیش کیوں اور کس لیے نامی جو کتاب لکھی اس میں پنجابیوں کے ساتھ مہاجر بیورو کریسی کو بھی استحصالی ٹولہ قرار دیا۔ ان کی کتاب میں بھی سندھ میں ہونے والے لسانی فسادات کا اثر بہت گہرا اور نمایاں ہے[۱۵۴]۔ ان سیاسی حالات پر بھی اس زمانے میں رئیس امروہوی نے متعدد قطعات لکھے۔ ملاحظہ کیجیے :

سخت الجھن ہے بلوچستان و سرحد کی رئیس　　ان مسائل میں ہے اپنی روح تک اٹکی ہوئی
سامنے آنکھوں کے سندھو دیش کا گرد و غبار　　سر پہ بنگلا دیش کی تلوار ہے لٹکی ہوئی[۱۵۵]

عام خیال یہی ہے کہ کراچی میں مہاجر قومیت کا نعرہ ایم۔ کیو۔ ایم۔ نے بلند کیا، حالاں کہ یہ نعرہ اس زمانے سے لگ رہا تھا جب سے کراچی اور سندھ کے دیگر شہروں میں رہنے والے مہاجروں کے حقوق غصب کیے جا رہے تھے۔ صورتِ حال یہ تھی کہ پاکستان کا ایک بازو علاحدہ ہونے کے باوجود حکمرانوں نے ہوش کے ناخن نہیں لیے تھے۔ اس رویے میں نصف صدی گزرنے کے بعد بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ جون ۱۹۷۳ء میں لکھے گئے ایک قطعے میں اس صورتِ حال پر رئیس امروہوی کہتے ہیں کہ :

کوئی اپنے حق سے نہ محروم ہو　　سنا ہے یہ سرکار کا حکم ہے
ملے سارے شہروں کو شہری حقوق　　کراچی کے بارے میں کیا حکم ہے[۱۵۶]

حقوق کی پامالی کا یہ سلسلہ جب اسی طرح جاری رہا تو ایم۔ کیو۔ ایم۔ کے قیام سے بہت پہلے ہی رئیس امروہوی اور اسی طرح کے دیگر مہاجر دانش وران خیالات کا اظہار کرنے لگے تھے کہ :

ان کو اندازۂ شمار نہیں ہمیں اپنے پہ اعتبار نہیں
بھائیو! اس بھرے گھرانے میں پانچ بھائی ہیں صرف چار نہیں[157]

یہ وہی زمانہ تھا جب ۱۳۱۳ مہاجر سرکاری افسران کو جبری ریٹائر کیا گیا تھا۔ کوٹا سسٹم بھی اسی دور میں نافذ ہوا تھا۔ مہاجروں کے کارخانوں اور بنکوں کو قومیا لیا گیا تھا۔ انھیں دوسرے اور تیسرے درجے کا شہری بننے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ صوبے کے تمام وسائل سندھیوں کے لیے وقف کر دیے گئے تھے۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے مہاجر سیاست دانوں کی آنکھ کھلی۔ جن مہاجر دانش وروں نے چند ماہ پیش تر ہی کراچی کو سندھ میں ضم کرنے کی درخواست جنرل یحییٰ سے کی تھی، انھی میں سے چند بزرگ مثلاً بابا ایم۔ ایم۔ پنشیر نے ''کراچی صوبہ تحریک'' کے نام سے تحریک شروع کی۔ ۱۹۸۰ء میں محمود الحق عثمانی نے ''کراچی صوبہ تنظیم'' قائم کی۔ احمد الطاف نے ''تحریک صوبہ کراچی'' اور اسلام صدیقی نے ''کراچی صوبہ پارٹی'' تشکیل دی۔ اسی زمانے میں مرزا جوّاد کو کراچی کے لیے میٹروپولیٹن سٹی کے اختیارات کا مطالبہ کرنے کی پاداش میں ۴ برس قید کی سزا دی گئی۔ یہ وہی زمانہ تھا جب کہ مہاجر شدید ترین احساسِ محرومی کا شکار تھے[158]۔ مہاجر زعما نے جنرل یحییٰ خان کی صوبہ کراچی کے قیام کے بارے میں پیش کش کو ٹھکرا کر سندھ کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کرنے کا شعوری فیصلہ کیا تھا[160]۔ لیکن اس فیصلے کے جو بھیانک نتائج اس قوم کو بھگتنے پڑے ہیں، اس پر مہاجر اکابرین بھی شرمندگی کا اظہار کر چکے ہیں۔ حسن عابدی نے تو خیر سندھ کی اس خراب صورتِ حال کا ذمہ دار سندھ کے وڈیروں، جاگیرداروں اور زمین داروں کو قرار دینے کے ساتھ ساتھ ان مہاجر زعما کو بھی موردِ الزام ٹھہرایا ہے جو اپنی چرب زبانی، جاہ پسندی بیوروکریسی کے اشارے پر مقتدر حلقوں کے ساتھ مل کر کبھی بنگالیوں، کبھی پٹھانوں اور کبھی سندھیوں سے اپنی نفرت اور بیزاری کا اظہار کرتے رہے ہیں[160]۔

حسن عابدی کے اس تجزیے کو جانب دار بھی قرار دیں تو بعض کڑوے حقائق سے انکار ممکن نہیں۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سندھ کے دیہی علاقوں اور شہری آبادی کے مشترکہ احساسِ محرومی کا ازالہ کرنے کے بجائے حکمرانوں نے یک طرفہ رویہ اختیار کرتے ہوئے شہری آبادی کو ان ثمرات سے محروم رکھنے کی جانب دارانہ کوششیں جاری رکھیں۔ کراچی کی آبادی جو سندھ کی آبادی کا تقریباً ۴۰ فی صد ہے، لیکن ملازمتوں کے کوٹے میں ان کا جائز حصہ تک انھیں نہیں دیا جاتا۔ وفاق نے بھی ہمیشہ اس شہر کے استحصال میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ آبادی کا ۸ فی صد ہونے کے باوجود وفاق کی ملازمتوں میں اس شہر کا کوٹا صرف ۲ فی صد مختص ہے۔ سندھ میں آباد ان ۴۸ فی صد مہاجرین جن کا جینا مرنا اور اقتصادی مفاد اسی صوبے سے وابستہ ہے وہ احساسِ محرومی کا شکار نہ ہوں تو پھر کیا ہوں[161]۔

اس پر طرّہ یہ کہ شہر کے تقریباً تمام ہی انتظامی محکموں میں مقامی لوگوں کے بجائے غیر مقامی لوگ قبضہ جمائے بیٹھے تھے۔ پولیس کے محکمے میں مہاجروں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ زیادہ تر پنجاب اور اندرون سندھ کے لوگوں کو اس محکمے میں ملازمتیں دی جاتی تھیں۔ کمشنر، ڈپٹی کمشنر کے دفاتر میں بھی کچھ یہی صورتِ حال تھی۔ ان غیر مقامی افراد نے ہمیشہ اس شہر سے روزگار تو حاصل کیا لیکن کبھی اس کو اپنا نہ سمجھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسائل کے حل کے بجائے یہ لوگ مسائل بڑھانے کا سبب بنے۔ نفع اندوزی، رشوت اور ناجائز ذرائع کا استعمال ان دفاتر میں معمول بن چکا تھا۔ اس صورتِ حال پر بھی رئیس امروہوی نے متعدد قطعات لکھے۔ جیسے :

یہ سازشیں یہ تصادم یہ مصلحت کوشی قدم قدم پہ سیاسی تضاد ہیں کیا کیا
یہ رشوتیں یہ خیانت یہ نفع اندوزی معاشرے میں معاشی فساد ہیں کیا کیا[۱۶۲]

شہر کے ساتھ برتی جانے والی اس بے رخی اور لاقانونیت نے شہر کا نقشہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا اور اب یہ شہر بہ قول رئیس امروہوی ایک کھنڈر کا نقشہ پیش کرنے لگا تھا۔ اس جانب توجہ دلاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ :

مسائل کی کثرت ہے اس شہر میں زمانے کی حالت یہ کیا ہوگئی
کراچی تھی پہلے عروس البلاد مگر اب عروس البلا ہوگئی[۱۶۳]

جب لاقانونیت کسی شہر میں بسیرا کر لے تو غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث افراد کو کھلی چھوٹ مل جاتی ہے۔ بدقسمتی سے ۱۹۸۰ء کی دہائی میں ہونے والی روس اور افغانستان کی جنگ کے نتیجے میں افغان مہاجرین کا جو ریلا کراچی آیا، اس نے بھی شہر میں ہونے والے جرائم کو خوب پروان چڑھایا۔ افغانیوں کی ہجرت کے نتیجے میں سب سے بڑا جو عفریت اس شہر کو ملا وہ مذہبی تشدد پسندی اور فرقہ بندی تھی۔ اس کا احساس بھی رئیس امروہوی کو اسی وقت ہو گیا تھا۔ اپنے کچھ قطعات میں اس جانب انھوں نے واضح اشارے بھی کیے۔ جیسے :

یہ تقاضا ہے ہوش مندی کا فرق کر پستی و بلندی کا
ابتدا ہی سے بعض لوگوں کو روگ ہے انتہا پسندی کا[۱۶۴]

اسی دور میں ہیروئن اور چرس کے کاروبار نے بھی خوب عروج حاصل کیا۔ جگہ جگہ شہر میں ہیروئن کے اڈے قائم تھے جہاں سے تھانے والوں کو معقول رقم ماہانہ پہنچ جاتی تھی اور بدلے میں شہریوں کو انتظامی مافیا کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتی تھی۔ اس صورتِ حال پر بھی رئیس کے ہاں قطعات ملتے ہیں۔ جیسے :

ہیروئن کا اور چرس کا کاروبار ہاں! مفادِ عامہ میں تو نہیں
پھر بھی ہر گوشے میں پاکستان کے ہیروئن موجود ہے ہیرو نہیں

اگر تم میں جینے کی ہمت نہیں پیو ہیروئن اور مرتے رہو
کہ فی الحال قومی چرا گاہ میں چرس رہ گیا ہے سو چرتے رہو[۱۶۵]

اسی دور میں ۱۹۸۵ سے ۱۹۸۷ کے دوران شہر میں ہتھوڑا گروپ نامی ایک تنظیم نے بڑی سنسنی پھیلا رکھی تھی۔ شہری اس گروہ سے بے حد خوف زدہ رہتے۔ اس گروہ نے فٹ پاتھ پر سوئے درجنوں افراد کو ہتھوڑے کے وار سے موت کی نیند سلا دیا تھا۔ اس خوف کی فضا کا حال بیان کرتے ہوئے رئیس امروہوی کا کہنا تھا کہ:

بھلا مجھ سے کیوں خوف کھائے کوئی قلم ہاتھ میں ہے ہتھوڑا نہیں[۱۶۶]

رئیس امروہوی نے تشدد کی کبھی حمایت نہیں کی لیکن بدقسمتی سے اس شہر میں تشدد کے عنصر نے بڑی تیزی سے گھر کر لیا تھا۔ وہ نوجوانوں کو اپنے رویے میں تبدیلی لانے کا درس دیتے ہوئے واضح طور پر کہتے ہیں کہ:

سکوت و سادگی سے غور کر احوالِ حاضر پر کبھی فکر و تردد سے مسائل حل نہیں ہوتے
تشدد بھی یقیناً فطرتِ انساں میں شامل ہے مگر پیارے تشدد سے مسائل حل نہیں ہوتے[۱۶۷]

مگر رئیس امروہوی اور اس قبیل کے دانش وروں کی باتوں کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ شہر آہستہ آہستہ آگ اور خون کی لپیٹ میں گھرتا چلا گیا۔ پے در پے ہونے والے واقعات نے اس تشدد کی فضا کو مزید ہوا دی۔ ۱۵ اپریل ۱۹۸۵ کو اک ٹریفک حادثے میں ہلاک ہونے والی سر سید گورنمنٹ گرلز کالج کی طالبہ بشریٰ زیدی کا سانحہ ہو[۱۶۸] یا بعد میں ہونے والے ردِ عمل، ان تمام واقعات کا بیانیہ رئیس کے قطعات میں موجود ہے۔ شہر کی اس صورتِ حال کا نوحہ لکھتے ہوئے رئیس کا کہنا تھا کہ:

افسوس کہ ویران ہے یہ خلد ادا شہر آلام کدہ شہر ہے آفات کدہ شہر
ہر شخص پہ اک وحشتِ بے نام ہے طاری صد حیف کہ یہ شہر ہے آسیب زدہ شہر[۱۶۹]

سہراب گوٹھ میں ہونے والے فوجی آپریشن کے بعد ہیروئن اور کلاشنکوف مافیا نے جس طرح اس شہر کو یرغمال بنایا اور مقامی لوگوں کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا، اس شہر کی تاریخ میں لاقانونیت کی ایسی مثالیں کم ہی ملیں گی۔ کراچی کی ایک غریب بستی قصبہ اور علی گڑھ کالونی میں مہاجر نوجوانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔ اس صورتِ حال پر پورے

شہر کی فضا نہایت افسردہ تھی۔ ایک قیامت تھی جو اس شہر پر گزری۔ ان قیامت خیز مناظر کو بھی رئیس نے اپنے قطعات میں قلم بند کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

وہ شہر جس میں کبھی تھا عروجِ فکر و نظر — وہاں رواجِ جنوں کے سوا کچھ اور نہیں
میرے شہر میں تمھیں ہے تلاش غنچہ و گل — یہاں تو چشمۂ خوں کے سوا کچھ اور نہیں

یقیناً اشرف المخلوق ہے انسان دنیا میں — مگر انسان کی پستی بھی یارو کم نہیں ہوتی
چرس اور ہیروئن کے زہر کی تم کو شکایت ہے — کلاشنکوف کی مستی بھی یارو کم نہیں ہوتی[۷۰]

ایسا نہیں کہ مقامی آبادی نے جو کچھ رد عمل دکھایا اس پر رئیس امروہوی خاموش تماشائی بنے رہے ہوں۔ اس زمانے میں نہتے عوام اس قتل و غارت گری کے خلاف متحد ہونا شروع ہو چکے تھے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ سیاسی سرگرمیوں کے نتیجے میں یہاں نئے نئے سیاسی اتحاد اور نئی نئی سیاسی جماعتیں قائم ہو رہی تھیں مگر اس عوامی اتحاد میں بھی کہیں کہیں تشدد کے آثار نظر آنا شروع ہو گئے تھے۔ مثلاً عوام کی طرف سے جلاؤ گھیراؤ اور املاک کو نقصان پہنچانے کا جو رویہ اس دور میں پیدا ہوا اس پر رئیس نے برملا کہا کہ:

تابکے خود پہ قہر ڈھاؤ گے — خود کشی سے نہ باز آؤ گے
دوستو! بس کرو خدا کے لیے — کب تک آخر بسیں جلاؤ گے[۷۱]

مجموعی طور پر یہ قطعات ایک ایسے شاعر کی فریاد ہے جو ہر دم اور ہر پل اپنے ملک کی سیاسی، سماجی اور معاشی فضا سے نہ صرف مایوس ہے بلکہ ہر اس مسئلے پر طنزیہ انداز میں اجتماعی اور انفرادی شعور کو اجاگر کرنے کی کوشش بھی کر رہا ہے۔ ایسے سیاسی و سماجی مسائل جنھوں نے ہمارے معاشرے کو اندر سے کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔ زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق افراد جو ذاتی مفادات کی خاطر قومی نقصانات کا موجب بنتے ہیں، رئیس کے نزدیک نہایت قابلِ مذمت ہیں[۷۲]۔ ان کے قطعات کو اگر پاکستان کے تاریخی ارتقا کی روشنی میں دیکھا جائے تو ان کا یہ دعویٰ کہ ''آئینۂ امروز ہیں مرے قطعات''، بجا طور پر درست اور مناسب نظر آتا ہے کیوں کہ یہ قطعات وقتاً فوقتاً رونما ہونے والے مختلف اور متنوع معاملات و مسائل کا دفتر ہیں۔ ان قطعات میں بڑے حقیقت افروز موضوعات ہیں۔ اور ان قطعات میں ادب اور زندگی اور تاریخ کے مابین ایک قوس سی کھنچی دکھائی دیتی ہے[۷۳]۔ خصوصاً شہرِ قائد کے حوالے سے یہ کہنا نہایت مناسب ہوگا کہ یہ قطعات کراچی کے حوالے سے ''شہرِ آشوب'' کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن میں مختلف النوع

مسائل اور حادثات و سانحات کو یکجا کر کے اس شہر سے اپنے گہرے تعلق کا اظہار کیا گیا ہے۔ جو کچھ مظالم اور استحصال کا رویہ اس شہر کے ساتھ روا رکھا گیا اس پر کھل کر احتجاج بھی کیا گیا اور اس کی مذمت کچھ اس انداز سے کی گئی کہ قطعات پڑھنے والے کو وہ چشم کشا حقائق کچھ سوچنے پر مجبور کر دیں۔ شہرِ قائد کی بابت اسی قطعے کو دیکھیے:

گزر گیا ہے جو قائد کے شہر پر طوفان
وہ دفترِ ستم و قصۂ جفا پڑھ لو
مزارِ قائداعظم کے فاتحہ خوانو!
دیارِ قائداعظم پہ فاتحہ پڑھ لو[۱۷۴]

حوالہ جات:

۱۔ غلام نبی مغل، سندھ کیا سوچ رہا ہے، (کراچی، پاکستانی ادب پبلشر، ۱۹۸۶)، ص ۱۱

۲۔ ڈاکٹر اسرار احمد، استحکامِ پاکستان: مسئلہ سندھ، (لاہور، مکتبہ جدید پریس، ۱۹۹۲)، ص ۳۵

۳۔ ڈاکٹر مبارک علی، سندھ: خاموشی کی آواز، (لاہور، پروگریسو پبلشرز، ۱۹۹۲)، ص ۳۵۱۔۳۵۳

۴۔ سید مظہر جمیل، آشوبِ سندھ اور اردو فکشن، (کراچی، اکادمی بازیافت، ۲۰۰۲)، ص ۳۹۔۴۴

۵۔ ہینری پوٹنجر، بہ حوالہ عثمان دموہی، کراچی: تاریخ کے آئینے میں (کراچی، راحیل پبلیکیشنز، ۲۰۱۳)، ص ۸۴

۶۔ ایضاً

۷۔ ایضاً

۸۔ ڈاکٹر شہزاد منظر، سندھ کے نسلی مسائل، (لاہور، فکشن ہاؤس، ۱۹۹۴)، ص ۱۴۷

۹۔ آشوب سندھ اور اردو فکشن، محولہ بالا، ص ۵۱

۱۰۔ احمد حسین صدیقی، گوہر بحیرہ عرب: کراچی، (کراچی، فضلی سنز، ۱۹۹۵)، ص ۶۲؛ لوراگائے، Karachi: Ordered Disorder and the Struggle for the City، (نیو دہلی، ہرسٹ اینڈ کو پبلشرز، ۲۰۱۴)، ص ۲۶

۱۱۔ Karachi: Ordered Disorder and the Struggle for the City، محولہ بالا، ص ۲۶

۱۲۔ عارف حسن، تفہیم کراچی: شہری مسائل اور مستقبل کی منصوبہ بندی، مترجم: شاہ محی الحق فاروقی، راشد مفتی، (کراچی، سٹی پریس، ۲۰۰۱)، ص ۱۷؛ لوراگائے نے ۷۳۵۶۰ جب کہ عارف حسن نے ۷۳۰۵۶ بتائی ہے۔

۱۳۔ گوہر بحیرہ عرب: کراچی، محولہ بالا، ص ۶۴۔۶۸

۱۴۔ تفہیم کراچی: شہری مسائل اور مستقبل کی منصوبہ بندی، محولہ بالا، ص ۱۷

۱۵۔ گوہر بحیرہ عرب: کراچی، محولہ بالا، ص ۸۷

۱۶۔ تفہیم کراچی: شہری مسائل اور مستقبل کی منصوبہ بندی، محولہ بالا، ص ۱۴۔۱۵

۱۷۔ گوہر بحیرہ عرب: کراچی، محولہ بالا، ص ۵۸۔۲۲۳

۱۸۔ کراچی: تاریخ کے آئینے میں، محولہ بالا، ص ۲۵۲۔۳۴۵

۱۹۔ Karachi: Ordered Disorder and the Struggle for the City، محولہ بالا، ص ۲۶

۲۰۔ کراچی: تاریخ کے آئینے میں، محولہ بالا، ص۹۷
۲۱۔ آشوب سندھ اور اردو فکشن، محولہ بالا، ص۵۳
۲۲۔ تفہیم کراچی: شہری مسائل اور مستقبل کی منصوبہ بندی، محولہ بالا، ص۲۱
۲۳۔ گوہر بحیرہ عرب: کراچی، محولہ بالا، ص۲۹
۲۴۔ ایضاً، ص۳۸
۲۵۔ کراچی: تاریخ کے آئینے میں، محولہ بالا، ص۲۹۷
۲۶۔ گوہر بحیرہ عرب: کراچی، محولہ بالا، ص۳۰۔۳۱
۲۷۔ کرنل ینگ کیتھ، بہ حوالہ گوہر بحیرہ عرب: کراچی، محولہ بالا، ص۶۲
۲۸۔ کراچی: تاریخ کے آئینے میں، محولہ بالا، ص۲۹۸
۲۹۔ محمد علی صدیقی، سندھ کا مسئلہ: پس منظر اور موجودہ صورتِ حال، مشمولہ: (کراچی، ارتقا، کتابی سلسلہ نمبر ۱۱)، ص۵۹۔۶۰
۳۰۔ آشوب سندھ اور اردو فکشن، محولہ بالا، ص۵۱
۳۱۔ Karachi: Ordered Disorder and the Struggle for the City، محولہ بالا، ص۲۶
۳۲۔ یوری گنکوفسکی، پاکستان کی قومیتیں، (ماسکو، دارالاشاعت ترقی، ۱۹۷۶)، ص۱۰۔۱۲
۳۳۔ سندھ کا مسئلہ: پس منظر اور موجودہ صورتِ حال، محولہ بالا، ص۵۹
۳۴۔ ایضاً، ص۶۰
۳۵۔ Karachi: Ordered Disorder and the Struggle for the City، محولہ بالا، ص۶۲
۳۶۔ آشوب سندھ اور اردو فکشن، محولہ بالا، ص۵۲
۳۷۔ سندھ کا مسئلہ: پس منظر اور موجودہ صورتِ حال، محولہ بالا، ص۶۱
۳۸۔ آشوب سندھ اور اردو فکشن، محولہ بالا، ص۵۲۔۵۳
۳۹۔ سندھ کے نسلی مسائل، محولہ بالا، ص۱۶۸۔۱۶۹
۴۰۔ آشوب سندھ اور اردو فکشن، محولہ بالا، ص۵۳
۴۱۔ رفعت خان ہیورڈ، کراچی کے گوٹھ، مترجم: اجمل کمال، مشمولہ: کراچی کی کہانی، جلد اول، (کراچی، سٹی پریس، ۲۰۰۷)، ص۲۱۵
۴۲۔ تسنیم احمد صدیقی، کچی آبادیاں کیوں؟، مترجم: اجمل کمال، مشمولہ: کراچی کی کہانی، جلد دوم، محولہ بالا، (کراچی، سٹی پریس، ۲۰۰۷)، ص۶۹۸۔۶۹۹
۴۳۔ گوہر بحیرہ عرب: کراچی، محولہ بالا، ص۱۹۴۔۲۳۶
۴۴۔ سندھ کے نسلی مسائل، محولہ بالا، ص۵۴۔۵۵
۴۵۔ آشوب سندھ اور اردو فکشن، محولہ بالا، ص۵۵۔۵۶
۴۶۔ سندھ کے نسلی مسائل، محولہ بالا، ص۲۱۔۲۲
۴۷۔ وی۔ اے آگتیف، سندھ تاریخ کے آئینے میں، مترجم ڈاکٹر محمود صادق، (کراچی، مکتبہ دانیال، ۱۹۸۹)، ص۱۷۲۔۱۷۳
۴۸۔ تفہیم کراچی: شہری مسائل اور مستقبل کی منصوبہ بندی، محولہ بالا، ص۲۲
۴۹۔ آشوب سندھ اور اردو فکشن، محولہ بالا، ص۵۷
۵۰۔ سندھ کے نسلی مسائل، محولہ بالا، ص۵۱
۵۱۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، رفت و بود، مرتبہ ڈاکٹر معین الدین عقیل، (کراچی، ادارۂ یادگارِ غالب، ۲۰۱۱)، ص۴۳۸
۵۲۔ حسن عابدی، سندھ: اب کیا کیا جائے؟، مشمولہ: (کراچی، ارتقا، کتابی سلسلہ نمبر ۱۱)، ص۷۷۔۷۹
۵۳۔ تفہیم کراچی: شہری مسائل اور مستقبل کی منصوبہ بندی، محولہ بالا، ص۲۴۵

۵۴۔ جی ایم سید، بہ حوالہ: سندھ کے حالات کی سچی تصویر، م،(کراچی، ہلال پاکستان،۱۹۶۹)، ص۷۵

۵۵۔ ہفت روزہ ندائے سندھ، بہ حوالہ: جی ایم سید کی سوچ: عزائم اور سیاست، از آزاد بن حیدر، (لاہور، دید شنید پبلی کیشنز، س ن)، ص۱۵۔۲۴

۵۶۔ آزاد بن حیدر، جی ایم سید کی سوچ: عزائم اور سیاست، (لاہور، دید شنید پبلی کیشنز، س ن)، ص۲۳۔۳۶

۵۷۔ ایضاً، ص۳۸

۵۸۔ ایضاً، ص۴۰۔۴۲

۵۹۔ کشور جیون، بہ حوالہ: سندھ کے حالات کی سچی تصویر، محولہ بالا، ص۱۰۲

۶۰۔ سندھ کے حالات کی سچی تصویر، بہ حوالہ، (کراچی، ہلال پاکستان،۱۹۶۹)، ص۱۳۰

۶۱۔ آشوب سندھ اور اردو فکشن، محولہ بالا ، بہ حوالہ ، سید، ہاشم رضا، Our Destination، (کراچی ، مصطفین اینڈ مرتضین، آئی سی ایس لمیٹڈ۱۹۹۱)، ص۳۸۴۔۳۸۵

۶۲۔ شہاب الدین رحمت اللہ، شہاب بیتی، (کراچی، پرنٹ میڈیا پبلی کیشنز،۱۹۹۰)، ص۲۴۔۲۶

۶۳۔ آشوب سندھ اور اردو فکشن، محولہ بالا، ص۷۰

۶۴۔ میر امداد علی، مس کراچی، مترجم: فہمیدہ ریاض، مشمولہ: کراچی کی کہانی، جلد اول، محولہ بالا، ص۳۱۶

۶۵۔ سندھ کا مسئلہ: پس منظر اور موجودہ صورتِ حال، محولہ بالا، ص۶۲

۶۶۔ رئیس امروہوی، مقدمہ، مشمولہ: قطعات، جلد اوّل، (کراچی، رئیس اکاڈیمی،۱۹۸۷)، ص۷

۶۷۔ قطعات، جلد اول، محولہ بالا، ص۹

۶۸۔ آشوب سندھ اور اردو فکشن، محولہ بالا، ص۷۳۔۷۴

۶۹۔ قطعات، جلد اول، محولہ بالا، ص۱۱

۷۰۔ ایضاً، ص۱۲

۷۱۔ تفہیم کراچی: شہری مسائل اور مستقبل کی منصوبہ بندی، محولہ بالا، ص۲۲

۷۲۔ قطعات، جلد اول، محولہ بالا، ص۱۲

۷۳۔ رئیس امروہوی، ہفت روزہ، شیراز، کراچی، اپریل ۱۹۹۵ء، ص۱۵، بہ حوالہ سید قاسم جلال، رئیس امرہوی: احوال و آثار، (کراچی، انجمن ترقی اردو،۲۰۰۸)، ص۳۰

۷۴۔ رئیس امروہوی، (کراچی، ہفت روزہ، اخبارِ جہاں، ۵فروری۱۹۶۷)، ص۱۰

۷۵۔ رئیس امروہوی، کراچی ۱۲۴سال قبل، کراچی نامہ (کالم)، مشمولہ: (کراچی، ہفت روزہ اخبارِ جہاں، ۱۲ فروری ۱۹۴۷)، ص۱

۷۶۔ پروین شاکر، کراچی، مشمولہ: افکار، از مجموعہ ماہ تمام، (اسلام آباد، مراد پبلی کیشنز،۱۹۹۴)، ص۱۷۷؛ لوراگائے نے اپنی تصنیف مذکور میں سہواً اس نظم کا حوالہ دیتے ہوئے خود کلامی کا حوالہ رقم کیا ہے جو غالباً درست نہیں۔

۷۷۔ قطعات، جلد اول، محولہ بالا، ص۱۲

۷۸۔ ایضاً، ص۱۳

۷۹۔ آشوب سندھ اور اردو فکشن، محولہ بالا، ص۸۵۔۸۶

۸۰۔ ایضاً، ص۸۰۔۸۲

۸۱۔ سندھ کا مسئلہ: پس منظر اور موجودہ صورتِ حال، محولہ بالا، ص۶۱

۸۲۔ آشوب سندھ اور اردو فکشن، محولہ بالا، ص۸۲۔۸۳

۸۳۔ ایضاً، ص۸۳

۸۴۔ سندھ کے نسلی مسائل، محولہ بالا، ص۱۰۱۔۱۰۲

۸۵۔ آشوب سندھ اور اردو فکشن، محولہ بالا، ص۸۳

۸۶۔ رئیس امروہوی، مقدمہ، مشمولہ: قطعات، جلد اول، محولہ بالا، ص۵
۸۷۔ ڈاکٹر سید قاسم جلال، رئیس امروہوی: احوال و آثار، (کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۸)، ص۱۵۷
۸۸۔ صہبا لکھنوی، رئیس امروہوی: زندگی فن و شخصیت کا جائزہ، مشمولہ: رئیس امروہوی: فن و شخصیت، مرتبہ صہبا لکھنوی، (کراچی ، رئیس امروہوی میموریل ٹرسٹ، ۱۹۹۰)، ص۳۸
۸۹۔ رئیس امروہوی، بہ حوالہ، رئیس امروہوی: زندگی فن و شخصیت کا جائزہ، ص۳۸
۹۰۔ http/len.m.wilkipedia.org.wiki
۹۱۔ محمد علی صدیقی، رئیس امروہوی، جام جہاں نما، مشمولہ: رئیس امروہوی فن اور شخصیت، محولہ بالا، ص۱۴۱۔۱۴۲
۹۲۔ قطعات، جلد اول، محولہ بالا، ص۳
۹۳۔ ایضاً، ص۱۸
۹۴۔ ایضاً، ص۲۱
۹۵۔ ایضاً، ص۴۶
۹۶۔ رئیس امروہوی، بہ حوالہ رئیس امروہوی: احوال و آثار، ص۱۶۶
۹۷۔ قطعات، جلد اول، محولہ بالا، ص۴۵
۹۸۔ ایضاً، ص۲۰
۹۹۔ ایضاً، ص۲۲
۱۰۰۔ ایضاً، ص۴۰
۱۰۱۔ ایضاً، ص۳۸
۱۰۲۔ ایضاً، ص۵۱
۱۰۳۔ ایضاً
۱۰۴۔ ایضاً، ص۶۰
۱۰۵۔ ایضاً، ص۸۳
۱۰۶۔ ایضاً، ص۱۱۷
۱۰۷۔ ایضاً، ص۱۰۸
۱۰۸۔ ایضاً
۱۰۹۔ ایضاً، ص۱۰۵
۱۱۰۔ ایضاً
۱۱۱۔ ایضاً
۱۱۲۔ ایضاً، ص۱۴۳
۱۱۳۔ ایضاً، ص۲۸۹، ۳۴۴
۱۱۴۔ ایضاً، ص۳۳۵
۱۱۵۔ رئیس امروہوی، قطعات، جلد دوم، (کراچی، رئیس اکاڈیمی، ۱۹۸۷)، ص۴۰
۱۱۶۔ ایضاً
۱۱۷۔ رئیس امروہوی، قطعات، جلد چہارم، (کراچی، رئیس اکاڈیمی، ۱۹۸۷)، ص۱۴۸
۱۱۸۔ قطعات، جلد اوّل، محولہ بالا، ص۱۸۶
۱۱۹۔ قطعات، جلد دوم، محولہ بالا، ص۵۰

۱۲۰۔ گوہر بحیرہ عرب: کراچی، محولہ بالا، ص ۱۶۴
۱۲۱۔ قطعات، جلد دوم، محولہ بالا ص ۲۰۳۔۲۰۷
۱۲۲۔ گوہر بحیرہ عرب: کراچی، ص ۱۶۴۔۱۶۵
۱۲۳۔ قطعات، جلد دوم، محولہ بالا، ص ۲۳۰۔۲۳۵
۱۲۴۔ قطعات، جلد چہارم، محولہ بالا، ص ۲۶۶
۱۲۵۔ ایضاً، ص ۱۹۶
۱۲۶۔ گوہر بحیرہ عرب: کراچی، محولہ بالا، ص ۱۶۸
۱۲۷۔ قطعات، جلد اوّل، محولہ بالا، ص ۱۶۲
۱۲۸۔ ایضاً، ص ۱۱۰
۱۲۹۔ ایضاً، ص ۱۶۰
۱۳۰۔ ایضاً، ص ۱۷۸
۱۳۱۔ قطعات، جلد دوم، محولہ بالا، ص ۲۹
۱۳۲۔ ایضاً، ص ۳۲
۱۳۳۔ ایضاً، ص ۳۰۴
۱۳۴۔ ایضاً، ص ۳۱۵
۱۳۵۔ ایضاً، ص ۳۶۴
۱۳۶۔ قطعات، جلد سوم، محولہ بالا، ص ۱۰
۱۳۷۔ ایضاً، ص ۱۳
۱۳۸۔ ایضاً، ص ۱۳۔۱۴
۱۳۹۔ ایضاً، ص ۴۵
۱۴۰۔ ڈاکٹر سلیم حیدر، اب سندھ تقسیم ہونا چاہیے، (کراچی، مطبوعات مہاجر تحریک، کراچی، ۱۹۹۱)، ص ۸۔۹
۱۴۱۔ قطعات، جلد سوم، محولہ بالا، ص ۴۵
۱۴۲۔ ذوالفقار علی بھٹو، پاکستان کی سیاسی حالت، (کراچی، پاکستان پیپلز پارٹی، ۱۹۶۸)، ص ۵۶
۱۴۳۔ قطعات، جلد سوم، محولہ بالا، ص ۵۰
۱۴۴۔ ایضاً، ص ۵۹
۱۴۵۔ ایضاً، ص ۶۰
۱۴۶۔ ایضاً، ص ۶۱۔۶۲
۱۴۷۔ جی ایم سید کی سوچ، عزائم اور سیاست، محولہ بالا، ص ۱۲۳
۱۴۸۔ قطعات، جلد سوم، محولہ بالا، ص ۶۶
۱۴۹۔ ایضاً، ص ۶۳
۱۵۰۔ ایضاً، ص ۶۷۔۶۸
۱۵۱۔ رئیس امروہوی، کلیاتِ رئیس امروہوی، (کراچی، ویلکم بک پورٹ، ۱۹۹۳)، ص ۴۸۰
۱۵۲۔ ایضاً، ص ۶۹
۱۵۳۔ ایضاً، ص ۸۲
۱۵۴۔ ظہیر احمد، سندھ میں قوم پرستی کے نئے اور پرانے رجحانات، (حیدر آباد، نیا دور پبلی کیشنز، ۱۹۸۷)، ص ۱۰۱

۱۵۵۔ قطعات، جلد سوم، محولہ بالا، ص۱۱۷

۱۵۶۔ ایضاً، ص۱۲۱

۱۵۷۔ ایضاً، ص۱۹۔۲۰

۱۵۸۔ اب سندھ تقسیم ہونا چاہیے، ص۵۶۔۵۷

۱۵۹۔ سندھ کا مسئلہ: پس منظر اور موجودہ صورتِ حال، محولہ بالا، ص۶۸

۱۶۰۔ سندھ: اب کیا کیا جائے؟، ص۸۰۔۸۱

۱۶۱۔ الیاس شاکر، جی ایم سید کے نظریات، مشمولہ: جی ایم سید کی مثبت اور منفی سیاست، مرتبہ جاوید احمد صدیقی، (کراچی، شبلی پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۷)، ص۱۵۱

۱۶۲۔ قطعات، جلد سوم، محولہ بالا، ص۴۴۳

۱۶۳۔ قطعات، جلد چہارم، محولہ بالا، ص۴۳

۱۶۴۔ ایضاً، ۱۳۷

۱۶۵۔ ایضاً، ص۲۵۱، ۴۰۵

۱۶۶۔ ایضاً، ص۳۹۷

۱۶۷۔ ایضاً، ص۳۴۰

۱۶۸۔ بہ حوالہ: http://en.wikipedia.org/wiki/death_of_Bushra_Zaidi

۱۶۹۔ قطعات، جلد چہارم، محولہ بالا، ص۴۴۳

۱۷۰۔ ایضاً، ۴۴۳۔۴۴۴

۱۷۱۔ ایضاً، ص۴۳۹

۱۷۲۔ رئیس امرہوی: احوال و آثار، محولہ بالا، ص۱۷۶

۱۷۳۔ اکرام بریلوی، رئیس امروہوی کے قطعات، مشمولہ: رئیس امروہوی: فن و شخصیت، مرتبہ صہبا لکھنوی، محولہ بالا، ص۱۷۴

۱۷۴۔ قطعات، جلد چہارم، محولہ بالا، ص۴۴۴

Abstract

This article aims at highlighting motives behind the stanzas (four liners) of renowned poet Rais Amrohvi, focusing on the social and political issues of Karachi. These stanzas were originally written for Urdu daily Jang and then compiled in books which ran through many editions. The stanzas selected here in this article to evidence the downtrodden masses of the city, its infrastructure and no urban planning has been here since partition. This has led the city into a madly urbanized one. It has two sections. Its first section shares multiple reasons and the tendency of cold shoulder from the administration and political regimes inherited the city over seven decades. Moreover, its second section includes the stanzas of the poet to show the timeline of the city and how the city and its habitants were resilient to face the highhandedness of the administration and political figures. The article mentions many primary sources to conclude its position.

Keywords: Rais Amrohvi, Qataat, Karachi, social and political injustice